جلد ۶ عدد ۱
محرم الحرام سنہ ۱۳۵۴ھ

رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲
رجسٹرڈ نمبر ایم (۲۹۵۰)

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ ۵)

قیمت فی پرچہ ۸ر

ایکہزار روپیہ نقد کے انعامات میں مدت کی توسیع

ایک انعام سو روپیہ دو انعام ۵۰ روپیہ ۔ چار انعام ۲۵ روپیہ آٹھ انعام ۲۰ روپیہ سولہ انعام ۱۰ روپیہ اور ۷۲ انعام پانچ پانچ روپیہ کے اس طرح جملہ ایک ہزار روپیہ کے ایک سو تین انعامات الاعظم کے ان خریداروں میں تقسیم ہوں گے جو یکم شہریور ۱۳۴۴ف م آخر جون ۱۹۳۵ء سے پہلے ایک سال کے لیے خریدار بن کر چھے روپیہ روانہ کردیں گے انعامات کی تقسیم قرعہ اندازی سے ہوگی اور ایکہزار خریداران کی تکمیل ضروری ہے جس کے لیے مدت میں توسیع کی گئی ہے اگر اب بھی تکمیل تعداد نہ ہوگی تو اسی تناسب سے انعامات کی رقم کم کردی جائے گی ۔ بہر حال ہر دس خریدار میں ایک کو انعام ملنا ضروری ہے ۔ آپ کے روانہ کردہ چھے روپیہ میں انعامات کے علاوہ سال بھر تک ہفتہ وار الاعظم اور ماہانہ الاعظم آپ کو ملے گا ہفتہ وار اخبار بڑے سائز کے (۲۰) صفحہ پر اور ماہانہ (۶۸) صفحہ پر شائع ہوتا ہے ہفتہ وار میں مملکت آصفیہ کے چپہ چپہ کی خبریں حیدرآباد عالم اسلام اور ممالک غیر کی تمام اہم خبریں افسانے نظمیں اور تمام وہ دلچسپیاں ہوتی ہیں جو آپ کو دکن کے کسی اخبار میں نہیں مل سکتیں اسی طرح ماہانہ الاعظم آپ کو ملک کے تمام ادبی رسائل سے بے نیاز کردے گا جس میں ملک و بیرون ملک کے مشہور اہل علم و قلم اصحاب کے مضامین شائع ہوتے ہیں ۔ بہر حال بہ حیثیت مجموعی صرف چھ روپیہ سالانہ میں آپ کو سال بھر تک ہفتہ وار اخبار ۔ ماہانہ ادبی رسالہ کیساتھ ملے گا ۔ گراں قدر انعامات بھی حاصل ہو سکتے ہیں ۔ بس دیر نہ کیجیے اور پہلی فرصت میں چھ روپیہ منی آرڈر سے روانہ کر دیجیے یا پہلے ایک کارڈ لکھکر

اخبار و رسالہ کا نمونہ مفت طلب فرما کر دیکھ لیجیے

منیجر الاعظم ثریا بلڈنگ پتھر گٹی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

ماہ محرم ۱۳۵۴ھ جلد ۶ عدد ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس مہینے سے "ترجمان القرآن" کا تیسرا سال شروع ہو رہا ہے۔ پہلا سال عسر کے ساتھ ختم ہوا۔ دوسرے سال میں خدا کے فضل نے یسر کی صورت دکھائی، اور اب اس تیسرے سال کے آغاز میں پھر عسر کے آثار نظر آرہے ہیں۔ مگر خواہ عسر ہو یا یسر، ہر حال میں اللہ ہی پر بھروسہ ہے، اور وہی بھروسہ کرنے کے لائق ہے۔ اس نے تاکید کے ساتھ فرمایا ہے کہ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ اس لیے ہم یقین رکھتے ہیں کہ اگر عسر میں ہم خدمت پر ثابت قدم رہے، اور اس کے سوا کسی کو مستعان و مجیب الدعوات نہ بنایا، اور اسی کے فضل پر بھروسہ رکھا، تو انجام کار میں پھر اس کی رحمت یسر کے ساتھ ہمارے شامل حال ہوجائیگی۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ سراء و ضراء کا توارد ہماری آزمائش کے لیے ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ۔ یہ ہمارے صبر کا امتحان ہے۔ ہمارے توکل علی اللہ کا امتحان ہے۔ اور اس چیز کا امتحان ہے کہ ہمارے دل میں اللہ کی کتاب اور اس کے دین کی خدمت کا جذبہ صادق ہے یا اس میں کچھ کھوٹ بھی ملی ہوئی ہے۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اس امتحان میں ہم کو کامیابی کی توفیق عطا فرمائے۔ اور آخر میں وہی مژدہ ہمیں سنائے جو صابرین کو سنایا جاتا ہے۔ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

اور اپنے فضل سے کامیابی کے وہ دروازے ہمارے لیے کھول دے جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہیں۔ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔

مسلمان قوم کی حالت اس زمانہ میں ایک بنجر زمین کی سی ہو رہی ہے جس میں اشجار خبیثہ تو خوب بڑھتے اور پھیلتے ہیں، مگر اشجار طیبہ کو نشو و نمو نصیب نہیں ہوتا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بہت سے خیر و صلاح کے بیج تو زمین ہی میں خاک ہو گئے، اور کسی کو تھوڑی بہت بالیدگی حاصل ہوئی بھی تو وہ جڑ نہ پکڑ سکا۔

میں اس حالت سے خود بھی واقف تھا، اور جب میں نے اس کام کو شروع کیا تو ان لوگوں نے بھی جن کو میری ذاتی فلاح و بہبود سے دلچسپی تھی مجھے نصیحت کی تھی کہ

زمین شورہ سنبل بر نیارد ۔ درو تخم عمل ضائع مگردان

لیکن میرے خیال میں مرد مسلمان کا کام یہ نہیں ہے کہ زمین کی خرابی، موسم کی ناموافقت، پانی کی کمیابی کو دیکھ کر ہمت ہار بیٹھے۔ اس کے لیے تو ازل سے یہی قسمت کیا گیا ہے کہ بنجر زمینوں میں ہل چلائے، ان کی شوریدگی کے خلاف جنگ کرے، اپنے پسینے بلکہ ہو سکے تو خون سے ان کو سیراب کرے، اور نتائج سے بے پروا ہو کر تخم ریزی کیے جائے۔ اگر زمین اس کی کوششوں سے سیر حاصل ہو گئی تب تو اس کی سرفرازیوں کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ لیکن اگر وہ اس ناکارہ زمین میں تمام عمر محنت بے حاصل کرتا رہے اور آخر ایک روز اسی کام میں جان دیدے، تب بھی حقیقت میں وہ ناکام نہیں ہے۔ اس کے لیے یہی کامیابی کیا کم ہے کہ جس کام کو وہ فرض سمجھتا تھا اس پر اپنی زندگی کی آخری ساعت تک قائم رہا، اور کوئی ناکامی اس کو ادائے فرض سے باز نہ رکھ سکی۔ ایسی ناکامی پر وہ ہزاروں کامیابیاں قربان جو ایک بگڑے ہوئے زمانے کی روش پر چلنے، اور اشجار خبیثہ کو پرورش کرنے، اور ان کے زہریلے ثمرات بیچنے سے حاصل کی جاتی ہیں۔

ان حالات میں جس شخص کو کام کرنا ہو، اس کو تو بدرجۂ اولیٰ صرف خدا کی تائید و نصرت پر بھروسہ رکھنا چاہیے، کیونکہ جس قوم کی بگڑی ہوئی ذہنیت کے خلاف وہ جہاد کر رہا ہے اس سے کسی مدد کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اور اگر چند نیک دل افراد اس کو مل بھی گئے تو محض ان کی تائید کے اعتماد پر کوئی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ ابتدا سے اس رسالے کی روش دیکھ رہے ہیں انہوں نے خود ہی اندازہ کر لیا ہوگا کہ ادارۂ ترجمان القرآن کوئی تجارتی ادارہ نہیں ہے ہمارے پیش نظر صرف ایک مقصد ہے، اور وہ مسلمانوں کو قرآن کی طرف دعوت دینا ہے۔ رسالہ کی اشاعت فی نفسہٖ مقصود نہیں، بلکہ محض اس دعوت کی اشاعت کے لیے ہے۔ ہر داعی و مبلغ کی طرح ہماری بھی یہ دلی خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں تک ہمارا پیغام پہنچے۔ ہمیں خریداروں کی ضرورت نہیں، پڑھنے والوں کی ضرورت ہے۔ اگر ایک رسالہ کو ہزار ہزار آدمی بھی پڑھیں تو ہمیں رنج نہ ہوگا بلکہ مسرت ہوگی۔ اگر ہمارے مضامین اخباروں اور رسالوں میں نقل کیے جائیں تو ہم ان کا شکریہ ادا کریں گے کہ انہوں نے اس دعوت میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ ہمیں اس کی بھی ضرورت نہیں کہ مضامین نقل کرنے والے اس رسالے کا حوالہ دیں۔ اگرچہ حوالہ دینا مستحسن ہے لیکن ہم اس کے خواہش مند نہیں کہ ہمارا نام بلند ہو۔ ہمیں صرف اپنی دعوت کی اشاعت مقصود ہے اور جو کوئی اس کام میں ہماری مدد کرتا ہے، ہم اس کے شکر گذار ہوتے ہیں۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ ترجمان القرآن کا ہر خریدار صرف خریدار اور ناظر ہی نہ ہو، بلکہ داعی اور مبلغ بھی ہو۔ ہندوستان کے کروروں مسلمانوں میں سے جس قلیل جماعت کو اللہ نے اس رسالہ کا مطالعہ کرنے کی توفیق عطا کی ہے، اگر وہ مطمئن ہے کہ یہ رسالہ جس راستہ کی طرف بلا رہا ہے وہ سیدھا راستہ ہے، اور مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح اسی رستے پر چل کر حاصل ہو سکتی ہے تو اس کو لازم ہے کہ اپنے عزیزوں دوستوں اور عام برادران دینی کو بھی اس کی طرف دعوت دے۔ ادارۂ ترجمان القرآن اور اس کے ناظرین کے درمیان محض بائع و مشتری کا سا تعلق نہ ہونا چاہیے۔ ہم اپنے ناظرین میں یہ احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اور وہ ایک ہی مشن کے

خادم ہیں۔ وہ اشاعت کی ذمہ داری تنہا ہم پر نہ چھوڑ دیں، بلکہ خود بھی حتی الوسع اس میں حصہ لیں۔

ہمارے پاس اکثر غیر مستطیع اصحاب کی درخواستیں چندے میں رعایت، اور بسا اوقات مفت رسالہ جاری کرنے کے لیے آتی ہیں۔ ان کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں علم قرآن کی سچی پیاس ہے، اور یہ پیاس آجکل ہم غریب مسلمانوں ہی میں زیادہ دیکھ رہے ہیں۔ جہاں تک ہمارے حالات نے اجازت دی ہم نے چندے میں رعایتیں بھی کیں۔ اور بلا قیمت بھی پرچے جاری کیے۔ دل چاہتا ہے کہ ہزاروں پرچے مفت تقسیم کیے جائیں، بلکہ سرے سے اس پرچے کی قیمت ہی لیتے ہوئے ہم کو کراہت محسوس ہوتی ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے پاس ایسے ذرائع نہیں ہیں جن سے ہم اس پرچے کے تمام مصارف پورے کر کے لوگوں کے چندوں سے بالکل بے نیاز ہو جائیں، یا کم از کم اس قابل ہو جائیں کہ غریب مسلمانوں کے ساتھ وسیع پیمانے پر رعایت کر سکیں۔ کاش مستطیع مسلمانوں میں ایسے اصحاب خیر موجود ہوتے جو دو دو چار چار غریبوں اور خصوصاً نادار طالب علموں کے نام پرچے جاری کرا دیتے۔

مقالات

کتب سماوی پر ایک نظر

کتب ہنود

(۱۴)

از جناب ذوقی شاہ صاحب

تمہید دنیا میں دو ہی قسم کے لوگ بستے ہیں۔ ایک وہ جو خدا کے قائل ہیں، خدا کو خدا سمجھتے ہیں، اور اس کی خدائی کو تسلیم کرتے ہیں، گو اس کے اسماء و صفات کی تفہیم میں اُن کے درمیان اختلافات ہوں۔ اور دوسرے وہ جو خدا کے وجود کا اپنے کو قائل نہیں تبلاتے اور اپنے لامذہب ملحد، دہریہ ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ یورپ میں آجکل ایک گروہ ایسا بھی ہے جو خدا کا نہ تو قائل ہے نہ منکر۔ مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ وہ کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ خدا ہو مگر ہمارے نزدیک ابھی تک اس کا ہونا ثابت نہیں ہوا گو اُس کے نہ ہونے کی کوئی قطعی دلیل بھی ہمارے ہاتھ نہیں آئی۔ بہرحال ہمارے مقاصد کے لیے اس گروہ کا شمول بھی خدا کے نہ ماننے والوں میں ہے اور باشندگان ارض کو بالآخر دو ہی گروہوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔

(۱) خدا کے ماننے والے اور (۲) خدا کو نہ ماننے والے۔

ہمارے ان مضامین سے ان لوگوں کو کوئی تعلق نہیں ہوسکتا جو خدا کو نہیں مانتے جب وہ خدا ہی کے قائل نہیں تو خدا کی بھیجی ہوئی کتابوں، خدا کے مبعوث کیے ہوئے پیغمبروں، اور خدا کی عطا کردہ ہدایت سے انہیں

کیا سروکار ہو سکتا ہے، مذہب کی تفہیم و تنقید اور مذاہب کے تقابل باہمی کا نہ انھیں کوئی منصب ہے نہ ان میں کوئی صلاحیت ہو سکتی ہے۔ ان کی مثال اس اجنبی اور ناواقف شخص کی سی ہے جو کسی ملک میں ابھی داخل ہی نہیں ہوا بلکہ اس ملک کے وجود ہی سے اسے انکار ہے۔ بھلا ایسا شخص اس ملک کے مختلف شہروں کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے اور ان شہروں کے متعلق کیا رائے قائم کر سکتا ہے اور اگر کوئی رائے پیش کرے بھی تو اس کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ مذاہب مختلفہ میں صحیح موازنہ وہی کر سکتا ہے جو خدا کو خدا ہونے کی حیثیت سے مانتا ہو اور اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہو کہ خدا اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے پیغمبروں کو مبعوث فرماتا ہے اور ان کے ذریعہ سے کتابیں نازل فرماتا ہے جن میں ہدایت اور رہنمائی ہوتی ہے۔

اس سلسلہ کا عنوان یعنے "کتب سماوی پر ایک نظر" ظاہر کرتا ہے کہ ان مضامین کا لکھنے والا یا ان سے دلچسپی رکھنے والا لامذہب سے متعرا نہیں ہو سکتا۔ کتب سماوی کے سماوی ہونے کا اعتراف ہی مستلزم ایمان باللہ و نزول ہدایت من اللہ ہے چنانچہ اس سلسلہ مضامین کے آغاز ہی میں مضمون نمبر ا کی ابتدا جن الفاظ سے ہوئی تھی وہ ناظرین کی یاد تازہ کرنے کی غرض سے ذیل میں دہرائے جاتے ہیں۔

"دہریت اور لامذہبی کے اس دور تاریک میں اللہ کے فضل و کرم سے اب بھی ایسے لوگ اس دنیا میں بکثرت موجود ہیں جو ہستی حق تعالیٰ کے قائل، ضرورت مذہب کے معترف، اور کتب سماوی کے منزل من اللہ ہونے کے معتقد ہیں مگر اس طبقۂ مذہبی کے وہ لوگ جو اپنے آبائی یا ملکی مذہب کی رسمًا یا تقلیداً کورانہ پابندی پر قانع رہنا پسند نہیں کرتے بلکہ ذاتی تحقیقات سے مذاہب مختلفہ کا مطالعہ و مقابلہ کر کے مذہب حق کی تلاش کے درپے رہتے ہیں اس تحقیقات کی اشد ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ جن صحف سماوی کو منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ ہے وہ اپنے دعویٰ میں کس حد تک صادق ہیں اس تحقیقات کے لیے عقل سلیم مندرجۂ ذیل امور قابل غور قرار دیتی ہے :۔

۱۔ جس کتاب کو منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ ہے وہ حقیقت میں منزل من اللہ ہے بھی یا نہیں؟

اگر ہے تو اس کی صورت و کیفیتِ نزول کیا تھی اور وہ کتب اور کس پر نازل ہوئی۔

۲- آج بھی وہ اپنی اصلی اور ابتدائی صورت میں محفوظ ہے یا اس میں لوگوں کی جانب سے ترمیمات و تنسیخات و تغییرات و تبدیلات و تحریفات لفظی و معنوی نے دخل پا کر کلام اصلی کی صورت کو بدل ڈالا ہے؟

۳- آیا اس کتاب کی تعلیمات سے بھی اس کے منزل من اللہ ہونے کی تائید ہوتی ہے اور وہ تعلیمات واضح، صاف، اور بنی نوع انسان کے لیے مفید اور کافی بھی ہیں یا نہیں؟''

تمہید منقولہ بالا سے ناظرین کو یاد آگیا ہوگا کہ یہ مضامین مذہبی طبقہ ہی سے متعلق ہیں اور دلدادگان مذہب ہی کے لیے انہیں لکھا گیا ہے۔ جو لوگ مذہب سے بے تعلق ہیں ان کی رسائی سے یہ مضامین بہت دور ہیں جب اس بات کو سمجھ لیا گیا کہ مذاہب کے اصول و فروع اور ان کی تعلیمات و ہدایات کی باریکیوں میں وہی جا سکتا ہے جو اللہ پر ایمان لایا ہو، مذہبیت کا معترف ہو، اور ہدایت من اللہ کی صداقت کا فی نفسہ مقر ہو تو اب اس بات کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ نہایت ضروری ہے کہ ایسا شخص مذاہب سماوی میں سے خاص طور پر کسی نہ کسی مذہب کا پابند ہو اور اس مذہب کے اندر کھڑے ہو کر اپنی تحقیقات کو شروع کرے۔ اگر تحقیقی طور پر نہیں تو تقلیدی طور پر ہی کسی مذہب میں داخل ہو کیونکہ اس میں اس کے لیے بڑی آسانی ہوگی اور اپنے مذہب کی تقلیدی پابندی بھی آگے چل کر تحقیقی رنگ اختیار کر لے گی اور اس پر منکشف ہو جائیگا کہ تحقیق کی نظر سے دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اس کے مذہب کو کیا مرتبہ حاصل ہے اگر ایسا نہ کرے گا تو اس کی تحقیقات ناقص رہے گی۔ اوپر ہی کی پیش کردہ مثال کو پھر لیجیے جو شخص کسی ملک (ملک مذاہب مختلفہ) میں داخل ہو چکا ہے وہ اس ملک کے مختلف شہروں (مذاہب) کی سیر و تفتیش کے لیے محتاج ہے کہ کسی شہر میں داخل ہو کر اپنا کام شروع کرے اور ایک شہر سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی جانب رُخ کرے جنگل اور پہاڑوں میں سرگردان رہنے سے وہ شہروں میں تقابل و موازنہ ہرگز نہ کر سکے گا۔

ہم نے ان مضامین میں اب تک جو نگاہ کتب سماوی پر ڈالی ہے وہ حدود اسلام میں مقید ہو کر

ڈالی ہے اور اسی کو ہمنے اس مطلب کے لیے اس وقت تک مفید ترین روش پایا ہے۔ اس نے ہمارے کام کو بہت آسان کر دیا بہت سے جھگڑوں سے ہمیں بچا لیا۔ ہمارے لیے ایک سیدھا اور آسان راستہ مہیا کر دیا اور جن کتب سماوی پر ہم اب تک نظر ڈال چکے ہیں ان کے ماننے والوں اور متبعین کی دل آزاری سے ہم بڑی حد تک بچے رہے۔ کسی دوسرے مذہب میں کھڑے ہو کر ہمارے لیے اتنی آسانیاں کسی طرح مہیا نہ ہو سکتیں بلکہ اندیشہ تھا کہ ہمارا قدم ضروری زمین کو طے ہی نہ کرنے پاتا اور کام نا تمام و ناقص رہ جاتا۔ مثلاً اگر ہم موجودہ مروجہ یہودیت میں کھڑے ہو کر اس کام کو شروع کرتے تو ہمیں اس مذہب کے شرائط ادا کرنے کے لیے لازمی تھا کہ انجیل اور قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کا ہم محض یہودی ہونے کی بنا پر ابتدا ہی میں انکار کر بیٹھتے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو ہمیں بنی اسرائیل ہی میں مقید و محدود سمجھ لینا پڑتا نتیجہ یہ ہوتا کہ تحقیقات کے میدان میں ہم ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتے۔ یا مثلاً مروجہ عیسائیت کے دائرہ میں کھڑے ہو کر ہمیں دوسری کتابوں پر نظر ڈالنی پڑتی تو یا تو ہم شروع ہی سے قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کا انکار کر دیتے یا پھر اس عیسائیت سے دست بردار ہو کر کسی اور جانب رخ کرنے پر مجبور ہوتے اسلام نے ہمارے لیے یہ آسانی مہیا کر دی کہ ابتدا ہی سے ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر توریت اور داؤد علیہ السلام پر زبور اور عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل کا اللہ کی جانب سے نازل ہونا تسلیم کر لیا اور ہمارے لیے صرف یہ دیکھنا باقی رہ گیا کہ جس صورت میں توریت وزبور و انجیل آج ہم اپنے سامنے پاتے ہیں آیا یہ وہی صورت ہے جس میں متذکرۂ بالا انبیا علیہم السلام پر یہ کتابیں نازل ہوئی تھیں۔

اگر دہریہ اور ملحد اور لا مذہب ہونے کی حیثیت سے ان کتابوں پر نظر ڈالی جاتی تو سب سے پہلے تو خدا کے وجود ہی پر بحث کرنے کی ضرورت پیش آتی اور یہ بحث سنکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات کو سیاہ کرنے کے بعد بھی تشنہ ہی رہتی بہر نوع اس بحث کے بعد بھی کسی کے نزدیک خدا کا وجود ثابت نہ ہوتا تو افعال الٰہی اور ہدایت الٰہی کی بحث ہی اس کے نقطۂ نظر سے اس کے لیے تفریح اوقات کا باعث ہوتی خدا کا

وجود تسلیم کر لینے والوں کے لیے پھر اس بحث کی ضرورت ہوتی کہ موسیٰ و داؤد و عیسیٰ علیہم السلام پیغمبر بھی تھے یا نہیں اور ان پر کوئی کتاب نازل بھی ہوئی تھی۔ ان مراحل کے طے کرنے کے بعد کہیں موجودہ موضوع پر بحث کی نوبت آتی۔

قطع نظر دہریت کے اگر کسی ایسے مذہب میں داخل ہو کر یہ بحث کی جاتی جس میں متذکرہ بالا انبیاء پر ایمان لانا جزو مذہب نہ ہوتا تو اس صورت میں بھی تقریباً وہی دقتیں پیش آتیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ اسلام نے ان تمام دقتوں سے ہمیں بچا لیا اور ہماری سمجھ میں یہ بات بھی اچھی طرح سے آگئی کہ جس طرح ایک لامذہب شخص مختلف مذاہب میں مقابلہ و موازنہ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا اسی طرح کوئی شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب میں مقید رہ کر بھی تحقیقات مذاہب کے کام کو کما حقہٗ انجام نہیں دے سکتا اسلام نے ایک ایسا معیار ہمیں دے رکھا ہے جس کی مدد سے ہم نہ صرف اسلام کو بلکہ دیگر مذاہب کو بھی، نہ صرف قرآن کو بلکہ دیگر صحف سماوی کو بھی اچھی طرح سے جانچ سکتے ہیں پرکھ سکتے ہیں، اور ان میں باہمی موازنہ کر سکتے ہیں۔ اس سے بہتر معیار اس وقت تک ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔

یورپ کے محققین جس معیار سے مذاہب پر تنقید کرتے ہیں وہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں کسی مذہبی گروہ کو اس سے اتفاق نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی محدود عقل کے سکڑے ہوئے بالشت سے فضائے قدس کی عظیم الشان وسعت کی پیمایش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ اپنے نظریوں اور اپنی تحقیقات سے بھی منحرف ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر اس مسئلہ کی بھی کسی قدر توضیح کی ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

بنی نوع انسان کے دنیا میں عروج و نزول کے متعلق بس دو ہی نظریے ہو سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ انسان اس دنیا میں اعلیٰ حالت لے کر آیا پھر اس نے بتدریج ادنیٰ حالت کی جانب تنزل کیا۔ اس کے بعد پھر وہ اپنی قدیم اصلی اور اعلیٰ حالت کی جانب کوشاں ہو رہا ہے۔

دوسرا یہ کہ انسان کی ابتدائی حالت ادنیٰ طبقہ کے جانوروں کی حالت سے مشابہ تھی، ترقی کی ارتقائی منزلیں طے کرتے کرتے وہ ایک مدت دراز میں اپنی موجودہ حالت تک پہنچا اور آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

پہلا نظریہ مسلمات مذہبی پر مبنی ہے اور دوسرا نظریہ محققین یورپ کے ظنیات پر۔ یہ ظنیات تاریخ عالم کے متعلق ناقص و ناتمام معلومات کی کوتاہیوں کی خانہ پری کی غرض سے وجود میں لائے گئے۔ یورپ نے عام طور پر پہلے نظریے کو ابھی تک قبول نہیں کیا۔ اس کی جملہ مذہبی اور تمدنی "تحقیقات" اور تاریخ عالم کے متعلق اس کی جملہ قیاس آرائیاں دوسرے نظریے ہی پر مبنی ہیں۔ اس نظریے میں خدائے برتر کا کہیں وجود نہیں صرف خدائے ظنی کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے اور اسے بھی وحشیوں کے تخیل کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انسان ابتدا میں وحشی تھا۔ جانوروں کی طرح جنگل میں اور پہاڑوں کے غاروں میں رہتا تھا۔ جاہل تھا مگر حساس دل اور متاثر ہونے والا قلب رکھتا تھا۔ رات کی تاریکی، بادل کی گرج، بجلی کی چمک، دکھ درد، علالت موت سے خائف و متاثر ہو کر اس نے اپنی سمجھ کے مطابق ایک بالاتر قوت یا متعدد بالاتر قوتوں کا تخیل قائم کر لیا اور نقصانات سے محفوظ رہنے اور اپنی ضروریات کے پورا ہونے کی خواہش میں اس قوت یا ان قوتوں کی وہ پرستش کرنے لگا جیسے جیسے اس وحشی انسان کی عقل بڑھتی گئی خدا یا دیوتاؤں کا تخیل بھی متغیر ہوتا گیا اس نظریے والوں کے نزدیک یہی تخیل پرستی جملہ مذاہب کی اصل ہے ان کے نزدیک ابھی تک اس میں اختلاف ہے کہ انسان کثرت پرستی سے وحدت پرستی کی جانب آیا یا وحدت سے کثرت کی جانب اترا۔ جرمنی کے مشہور سنسکرت دان میکس مُلر جنہوں نے رگ وید کا ترجمہ بھی کیا ہے اور زبان سنسکرت کی تاریخ بھی لکھی ہے اور انگلستان کے مشہور فلاسفر ہربرٹ اسپنسر منجملہ ان لوگوں کے ہیں جو کہتے ہیں کہ انسان پہلے کثرت پرست، شجر پرست، اجداد پرست تھا۔ بعد میں موحد ہوا اور خدا پرست بنا اس خیال کے لوگ یورپ میں بکثرت موجود ہیں مگر وہاں اب بعض محققین ایسے بھی پیدا ہو گئے ہیں جو متذکرۂ بالا خیال کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جدید ترین معلومات

کی بنا پر اور قرائن و آثار نو یافتہ کی شہادت کی رو سے بوثوق یہ بات پائی جاتی ہے کہ ابتدا میں انسان
خدا پرست تھا۔ اپنی اس ابتدائی اصلی حالت سے گرتے گرتے مشرک و بت پرست و کثرت پرست
ہو گیا۔ یورپ کے نقار خانے میں یہ آواز ابھی تک گونجی نہیں ہے اور وہاں کا بیشتر حصہ اپنی پرانی
ہی غلطی پر اڑا ہوا ہے۔

نظریہ ارتقاء کے یہ متوالے اپنی تنقید کو ایک درمیانی منزل سے شروع کرتے ہیں۔ انسان کی
نزولی حالت کو جو کہ ایک درمیانی حالت ہے ابتدائی حالت قرار دیتے ہیں۔ پستی جہالت وحشت سے تاریخ
انسانی کا آغاز کرتے ہیں مگر اس پستی سے قبل کی حالت پر سے پردہ نہیں اٹھاتے۔ صاف صاف یہ نہیں بتلاتے
کہ اصلی ابتداء کب اور کیونکر اور کس حالت میں ہوئی۔ ان کا مفہوم ارتقاء اس گتھی کو نہیں سلجھا سکے گا تاوقتیکہ وہ اس مفہوم کی اصلاح نہ کریں۔ دنیا میں
ہر چیز محدود ہے۔ ارتقاء کا میدان عمل بھی محدود ہے۔ محدود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ایک ابتداء ہے اور ایک
انتہا۔ حیوان کتنی ہی ترقی کرے حیوان ہی رہے گا۔ انسان ہرگز نہ بن سکے گا۔ انسان کتنی ہی ترقی کرے انسان
ہی رہے گا۔ خدا نہ بن سکے گا۔ یہ ممکن ہے کہ انسان ادنیٰ انسانی حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ انسانی حالت
پر جا پہنچے۔ مگر اب تک علمی تجربہ یا ناقابل تردید دلائل سے یہ بات ثابت نہ ہو سکی کہ کوئی ادنیٰ کیڑا مکوڑا یا
بڑا جانور یا لنگور یا بندر اپنی ذات سے کبھی کسی حالت میں بھی انسان بن گیا ہو۔ اگر نفس ارتقاء نہیں تو
نوعیت و حدود ارتقاء کے متعلق تو یورپ میں بھی اب شدید اختلافات رونما ہو رہے ہیں۔ انگلستان
میں تو سرے سے تخیل ارتقاء ہی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے ایک تحریک شروع ہو گئی
ہے جو ایولیوشن پروٹیسٹ موومنٹ (Evolution Protest Movement)
کے نام سے موسوم ہے۔ کیپٹن برنارڈ ایکورتھ اس تحریک کے بانی ہیں۔ اس جماعت کے
لوگ ثابت کر رہے ہیں کہ ارتقاء کا تخیل ہی غلط ہے اور یہ تخیل ہی نوع انسان کو گمراہ کر رہا ہے اور ہلاکت
کی جانب لے جا رہا ہے۔ اس لیے یہ لوگ زور لگا رہے ہیں کہ نظریہ ارتقاء کی تعلیم علمی درسگاہوں سے

موقوف کردی جائے ۔

حال میں مخالفین ارتقار کا ایک جلسہ لندن میں منعقد ہوا جس کے صدر انگلستان کے مسلّم اور ممتاز سائنس دان سر ایمبروس فلیمنگ تھے ۔ اس جلسہ کا حال اور اس کے صدر کی تقریر ۲۸ فروری ۱۹۳۵ء کے ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہو چکی ہے ۔ سر فلیمنگ کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

بکثرت علمار علوم حیوانات اس پر متفق ہیں کہ ڈارون کا نظریہ ارتقار پوری طرح ثابت نہیں ہوا ۔ مگر عام طور پر اس بات کو دبایا جاتا ہے اور پبلک کو غلط باور کرایا جاتا ہے کہ جملہ سائنس داں متفق ہیں کہ انسان کے مورث اعلیٰ دس لاکھ سال قبل لنگور اور بندر تھے غلط اور فرضی تصاویر کے ذریعہ انسان اور بندر کی ہڈی، اعضار اور خون میں مماثلت بتلائی جاتی ہے لیکن طبائع و روحانیت کے اختلافات سے چشم پوشی کی جاتی ہے ۔ اس نظریہ کی رو سے انسانی قوت اور ذاتی جد وجہد ہی سب کچھ ہے ۔ قوت والے ہی ترقی کرتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں ۔ کمزور ہلاک ہو جاتے ہیں قوت والوں کے لیے سب کچھ جائز ہے کمزوروں کو دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں ۔ جب بندر اپنی ذاتی قوت و جد وجہد سے ارتقائی وادیوں میں سے کودتا ہوا اچھلتا ہوا نکل کر آیا اور انسان بن گیا تو تخلیق کوئی چیز نہ رہی ۔ اور جب تخلیق ہی کوئی چیز نہ رہی تو خالق کا وجود بھی ذہنوں سے خارج ہو گیا اور خدا کا انسان کو "اپنی صورت" پر پیدا کرنے کا صحیح مفہوم ہی جاتا رہا تمام مذاہب کی جڑیں کٹ گئیں ۔ اور اخلاق حسنہ دنیا سے رخصت ہو گئے ان خیالات کے عالمگیر ہو جانے سے دنیا میں بڑی ابتری پھیل گئی اور دنیا کے چین و امن کو اس منحوس فلاسفی سے سخت صدمہ پہنچا ۔ سر فلیمنگ کا بیان ہے کہ بہت سے قابل اور عمیق نظر رکھنے والے غور وخوض کرنے والے لوگ انفرادی طور پر سر فلیمنگ کی اس رائے سے متفق ہیں کہ ڈارون

کا یہ فلسفہ ارتقار ہی یورپ کی گذشتہ جنگ عظیم کا باعث ہوا۔"

ارتقار کا یہ جنون آج کل اہل یورپ پر اس درجہ مسلط ہے کہ وہ لوگ مذہب کو بھی اسی فلسفہ دہریت کے معیار سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مذہب چونکہ انسانی تخیلات و توہمات کا نتیجہ ہے اس لیے انسان کی دماغی ترقی کے ساتھ ساتھ مذہب میں بھی تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ وہ لوگ اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مذہب وحی الٰہی کا نتیجہ ہے اور اس میں ترمیم و تنسیخ کا حق کسی بندہ کو حاصل نہیں۔ متقدمین و متاخرین کی مذہبی تحریروں میں صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہوتا ہے۔ زمانہ مابعد کے لوگ زیادہ تفصیل کے محتاج ہوتے ہیں بمقابلہ زمانہ ماقبل کے لوگوں کے۔ اس تفصیل کو اہل یورپ عام طور پر اضافہ اور ترقی اور مذہب کے ابتدائی رنگ کو بدل دینے کے نام سے پکارتے ہیں حالانکہ یہ ان کی غلطی ہے

کوئی مذہبی گروہ یورپ کے اس معیار کو قبول نہیں کر سکتا نہ کسی مذہبی گروہ کے نزدیک یورپ کا یہ نظریہ درست ہے کہ انسان کی ابتدا پستی و جہالت و وحشت سے ہوئی۔ نہ اس بات کو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ مذہب انسانی توہمات کا نتیجہ ہے۔ جملہ آسمانی مذاہب باختلاف الفاظ اس عقیدہ کی اصل پر متفق ہیں کہ ابوالبشر اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے جن کی تخلیق براہ راست اللہ تعالیٰ نے فرمائی علم حقائق و عرفان و اسمار وصفات کی تعلیم براہ راست حق تعالیٰ سے اُن کو حاصل ہوئی۔ اخلاق حسنہ کا اپنی اولاد کے لیے وہ نمونہ بنے۔ اور انہوں نے ان جملہ امور کی تعلیم اپنی اولاد کو دی۔ امتداد زمانہ سے جب اس تعلیم کے اثرات ضعیف ہو گئے اور لوگ سیدھے راستہ سے بھٹک گئے اور ان میں خرابیاں پیدا ہو گئیں اور اپنی ابتدائی حالت سے وہ گر گئے تو ان کی اصلاح کی غرض سے ان حالات میں وقتاً فوقتاً اولاد آدم ہی میں سے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے بھگوت گیتا میں بھی کرشن جی مہاراج کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ:۔

"اے گناہوں سے بری! ابتدا ہی سے ہم نے اس دنیا کو عبادت کے دو طریقے دے رکھے ہیں۔ علم برائے گیان دھیان اور عمل برائے عمل کنندگان بغیر عمل کے کوئی اطلاق

تک نہیں پہنچ سکتا اور ترک عمل سے کوئی کامل نہیں ہو سکتا۔" (۳، ۲ و ۴)۔

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ:۔

"اے بھارت کی اولاد! جب کبھی دھرم کا زوال اور بے دھرمی کی زیادتی ہوتی ہے تو ہم صورت (انسانی) میں ظہور فرماتے ہیں تاکہ نیک عمل کرنے والوں کی حفاظت کریں اور بدکاروں (کی بدکاریوں) کو فنا کر دیں (اور اس طرح) ہمارا ظہور ہر زمانہ میں ہوتا رہتا ہے۔" (۴، ۷ و ۸)۔

بحث مندرجہ بالا سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ ہندو دھرم کی کتابوں کے متعلق ہم اپنے ان مضامین میں اہل یورپ کی "مذہبی تحقیقات" اور ان کے نتائج افکار سے افسوس ہے کہ کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکیں گے۔ توریت و انجیل کی بحث میں بھی ہم نے اُن ہی پرانے عیسائی محققین کے اقوال پیش کرنے پر قناعت کی جو اپنے ہم مذہبوں کے نزدیک دل سے مذہبی ہونے کی شہرت رکھتے تھے۔ کیونکہ مذہب کے معاملہ میں اہل مذہب کی نگاہ میں ان ہی لوگوں کے اقوال کی کچھ وقعت ہو سکتی ہے جن کے دلوں میں مذہب کا احترام ہو اور جن کے متعلق یہ بات قیاس میں بھی نہ آسکتی ہو کہ وہ اپنے مذہب کو بدنام کرنے کے لیے کذب بیانی سے کام لیں گے! افسوس کے ساتھ اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آجکل دہریت کا رنگ لوگوں پر اس قدر غالب ہے کہ عوام تو ایک طرف بعض پادریوں کے متعلق بھی اطمینان نہیں ہو سکتا کہ وہ سچے دل سے عیسائی ہیں یا اپنے منصب اور عہدہ اور تنخواہ کی خاطر عیسائی بنے ہوئے ہیں اس لیے ہم نے توریت و انجیل کے معاملہ میں بھی جدید مصنفین کے اقوال پر اعتماد کی روش کو محفوظ نہ سمجھا۔ ہاں اگر مذہب اور لامذہبی کے درمیان مقابلہ ہوتا تب البتہ ہم ان لوگوں کے اقوال پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کرتے! اسی اصول کی پابندی میں ہم ہندوؤں کی کتب مقدسہ پر تنقید کے سلسلہ میں محققین یورپ کے اُن اقوال پر تو غور کریں گے جو تاریخ اقوام یا تاریخ زبان سنسکرت یا آثار قدیمہ کی جدید معلومات سے متعلق ہوں مگر مذہب اور مذہب کے

ارتقائی تعبیرات پر جو کچھ ان لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے اُس سے حتی الوسع اجتناب کریں گے۔

یہاں پھر ہم اسی بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ جملہ مذاہب کی چھان بین کے لیے اس وقت تک کوئی معیار اسلامی معیار سے بہتر ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔ مگر باوجود ان تمام آسانیوں کے جو اسلام نے اس معاملے میں ہمارے لیے مہیا کی ہیں جو کام اب ہمارے درپیش ہے وہ نسبتاً کسی قدر مشکل ضرور ہے۔ توریت و زبور و انجیل کے آسمانی کتابیں ہونے کی شہادت قرآن نے دے دی ہے۔ اس لیے ان کتابوں پر تنقید ہمارے لیے آسان ہوگئی لیکن ہندوستان کے نہ کسی نبی کا نام قرآن نے ہمیں تلایا نہ کسی صحیفہ سماوی کے نزول کا کوئی تعین ہمارے لیے کیا اس لیے ہماری تحقیقات کا میدان ذرا وسیع ہو گیا ہے۔ باوجود اُن مشکلات کے جن کا ہمکو مقابلہ کرنا نہایت ضروری ہے اسلام نے یہ بہت بڑی آسانی ہمارے لیے فراہم کر دی کہ قرآن نے ایک کلیہ ہمارے لیے قائم کر دیا ہے کہ خدا کی ہدایت سے کوئی قوم محروم نہیں رکھی گئی قرآن کی مندرجۂ ذیل آیات اس کلیہ کی تائید کے لیے کافی ہیں:-

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ۔ (۱۰: ۵) "اور ہر امت کے لیے ایک رسول (گذرا) ہے"

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ (۱۳: ۱) "ہر قوم کے لیے ہادی مقرر ہوتے چلے آئے ہیں۔"

پھر یہ بھی فرما دیا گیا ہے کہ اُن میں سے صرف بعض کا حال بیان کیا گیا ہے۔ سب کا نہیں:-

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ (۴: ۲۳) "اور ایسے پیغمبروں کو صاحب وحی بنایا جنکا حال اس کے قبل ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں اور ایسے پیغمبروں کو بھی جنکا حال ہمنے آپ سے بیان نہیں کیا۔"

ان ہادیان برحق کے متعلق اصولی معلومات جو قرآن سے ہمیں حاصل ہوئی ہیں حسب ذیل ہیں:-

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِيْ إِلَيْهِمْ (۱۶: ۶) "اور ہم نے آپ سے قبل صرف مردوں ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔"

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (۱۲-۱۳)

"اور ہم نے آپ سے قبل جتنے رسول بھیجے وہ صرف مرد ہی تھے (اور) شہروں کے رہنے والے تھے۔"

یعنی کبھی کسی فرشتے کو یا دیوتا کو یا دیوی کو یا عورت کو یا جن کو پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا اور جسے پیغمبر بنا کر بھیجا وہ جنگلی پہاڑی وحشی دیہاتی یا کسی مبتذل طبقہ کا شخص نہ تھا بلکہ اعلیٰ طبقہ کے مہذب و متمدن شہریوں میں سے تھا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (۱:۱۴)

اور ہم نے جملہ پیغمبروں کو ان ہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا تاکہ انھیں سمجھا سکیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو صحف سماوی جس قوم پر نازل ہوئے وہ اسی زبان میں نازل ہوئے جو کہ اس قوم میں بولی جاتی تھی اور بہ آسانی سمجھی جاتی تھی اور ہر صحیفہ سماوی اس غرض سے نازل ہوا کہ عام طور پر سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے نہ یہ کہ وہ چیستان اور معمہ بنا کر بھیجا گیا ہو کیونکہ ہدایت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس ہدایت کو بہ آسانی سمجھ سکیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴۰:۸)۔

"اور کسی رسول کو یہ اختیار نہیں کہ کوئی آیت بغیر حکم الٰہی کے لے آوے۔"

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ط وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ط لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝ (۶:۱۳)

اور ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور بچے بھی دیے اور کسی پیغمبر کے اختیار میں یہ امر نہ رکھا کہ ایک آیت بھی بلا اذن اللہ کے لاسکے ہر زمانہ کے مناسب خاص خاص احکام ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ہی جس حکم کو چاہتا ہے اسے موقوف کر دیتا ہے اور جس حکم کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور ام الکتب (تمام کتابوں کی جڑ) اسی کے نزدیک ہے

معلوم ہوا کہ جو پیغمبر بھیجے گئے وہ عام طور پر عوام الناس کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے اور ان ہی کی طرح بیوی بچے بھی رکھتے تھے، کھاتے پیتے بھی تھے، بیمار بھی ہوتے تھے، صحت بھی پاتے تھے، مثل دیگر انسانوں کے وہ بھی انسان ہوتے تھے۔ صرف خدا کی طرف سے پیغام کے پہنچانے والے ہوتے تھے اور اللہ ہی کے حکم سے جملہ احکام شریعت نافذ کرتے تھے۔ انھیں اپنی طرف سے کسی جدید حکم کے دینے یا پرانے حکم کے منسوخ کرنے کا اختیار نہ ہوتا تھا۔ ہر زمانے کے مناسب خاص خاص احکام ہوا کرتے ہیں جو اوامر و نواہی سے متعلق ہوتے ہیں اور ان میں ترمیم و تنسیخ اللہ تعالیٰ ہی فرمایا کرتا ہے کیونکہ جس حکمت پر وہ اور جملہ ادیان کی ہدایات مبنی ہوتی ہیں انکا علم اسی کو ہوتا ہے کسی اور کا اس میں دخل نہیں اور کسی اور کو حق حاصل نہیں کہ خدا کی اتاری ہوئی شریعت میں اپنی طرف سے رد و بدل کرے بس پیغمبر اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی شریعت کا شارح اور سمجھانے والا اور تعلیم دینے والا ہوتا ہے اور اس خدمت کو بھی وہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے تحت میں انجام دیتا ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (۱۶:۵)

"اور تحقیق ہم ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر بھیجتے رہے ہیں (اس تعلیم کے لیے کہ لوگو تم خاص) اللہ ہی کی عبادت کرو اور غیر اللہ کی عبادت سے بچتے رہو۔"

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ (۲۱:۲)

اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں اس لیے میری ہی عبادت کیا کرو۔"

وَاسْأَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَٰنِ آلِهَةً يُعْبَدُونَ ۔ (۴۳:۴) ۔

"اور آپ ان سب پیغمبروں سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے پوچھ لیجیے کہ کیا ہم نے خدائے رحمان کے سوا دوسرے معبود بھی ٹھیرائے تھے۔"

ان آیات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہر امت کے لیے جو پیغمبر مبعوث ہوئے انہوں نے توحید ہی کی تعلیم اپنی امت کو دی، شرک سے منع کیا، اور غیر اللہ کی عبادت سے سختی سے روکا یعنی ہر مذہب کی بنیاد توحید پر ہے اور مذاہب کے بنیادی اصول کا یہ وہ مسئلہ ہے جس میں کبھی کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا۔ جن امور میں مناسبت زمانہ سے حق تعالیٰ کی طرف سے ترمیمات ہوتی رہی ہیں وہ سب فروعی ہیں عقائد اور بنیادی اصولوں میں کبھی کوئی تغیر نہیں ہوا۔ چنانچہ ہمارے ہاتھ ایک بڑا معیار یہ آگیا کہ جو مذہب بھی توحید سے جتنا قریب ہے وہ اپنی اصلی ابتدائی صورت سے اتنا ہی قریب ہے اور جو مذہب توحید سے جتنی دور جا پڑا اس کو صداقت سے اتنا ہی بعد ہو گیا۔ (باقی)

اہل کتاب اور ایمان بالرسالت

(۳)

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی اے

تیسری آیت یہ پیش کی جایا کرتی ہے:-

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ۔ وَ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ۔ اُولٰٓئِكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۔

(۲۸ : ۶)

جن لوگوں کو ہم نے قرآن سے پہلے کتابیں دی ہیں وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے بیشک یہ حق ہے جو ہمارے رب کی طرف سے (نازل ہوا) ہے ہم تو اس سے پہلے ہی ماننے والوں میں ست تھے۔ ان لوگوں کو دہرا اجر ملے گا: بہ سبب اس کے کہ انہوں نے استقامت دکھائی اور وہ بدی کا دفعیہ نیکی سے کر دیتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

اس سے نتیجہ یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اہل کتاب جب قرآن کریم پر ایمان لائیں تو ان کو دہرا ثواب ملتا ہے۔ لہذا اگر وہ ایمان نہ لائیں تو ان کو، بہ حیثیت اہل کتاب ہونے کے، ایک حصہ تو ثواب کا ضرور مل جاتا ہے اس لیے قرآن ان کے محض اہل کتاب ہونے کی حیثیت کو بھی ایمان ہی سے تسلیم کرتا ہے۔

یہاں الجھن پھر اسی "لہذا" نے پیدا کی ہے جس کا اوپر ذکر کیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ قرآن

کریم نے دہرا حصہ محض اہل کتاب کے لیے ہی مخصوص نہیں کیا بلکہ بعض حالتوں میں جملہ اہل ایمان کے لیے دہرا حصہ مقرر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۷ : ۴)

اے ایمان والو تم اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اللہ تم کو اپنی رحمت سے ثواب کے دو حصے دے گا اور تم کو ایسا نور عنایت کریگا کہ تم اس کو لیے ہوئے چلتے پھرتے رہو گے۔ اور تم کو بخش دے گا۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔

ظاہر ہے کہ اہل کتاب کے ایمان لانے پر جو دہرا ثواب دیا گیا ہے، اس میں ایک حصہ ان کے پہلے ایمان کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ دہرے حصہ میں دوسرے مسلمان بھی شامل ہیں یا نہیں۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کا یہ خاص اعجاز ہے کہ وہ ایسے اعتراضات کا جواب بھی ساتھ ہی ساتھ دیتا چلا جاتا ہے بشرطیکہ بصیرت سے اس کا مطالعہ کیا جائے (۵۷ : ۴) کی آیت اوپر درج ہے اس میں ذکر ہے کہ ایمان والوں کو دہرا حصہ ملے گا۔ اس کا جواب اس آیۃ کے ساتھ ہی متصل ہے

لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۵۷ : ۴)

(یہ دو حصے اس لیے عنایت کرے گا) تاکہ اہل کتاب کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ ان لوگوں کو اللہ کے فضل کے کسی جزو پر بھی دسترس نہیں اور یہ کہ فضل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے دیدے۔ اللہ بڑے فضل والا ہے۔

لیجیے معاملہ صاف ہو گیا۔ یہ دو حصے اس لیے ہیں کہ اہل کتاب کو معلوم ہو جائے کہ ان کے لئے ایک حصہ تو کجا، اس کا کوئی جزو بھی نہیں ہے۔ اللہ کا فضل مشروط بہ ایمان ہے۔ فرمائیے اب کیا اعتراض کی گنجائش ہے؟ انکا دعوی ہے کہ اہل کتاب کے ایمان لانے پر چونکہ دہرے ثواب کا وعدہ ہے۔ لہذا اگر وہ ایمان نہ بھی لائیں تو ایک حصہ ان کا برقرار رہتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی کاریگر سے کہیں کہ دیکھو بھائی! اگر تم ہمارا کام کر دو۔ تو ہم تمہیں ایک کی بجائے دو روپے دیدیں گے۔ اگر اس نے آپ کا کام ٹھیک کر دیا تو

دو روپے کا حقدار ہے۔ اور اگر اس نے نہ بھی کیا تو بھی ایک روپیہ کا تو اس کا حق کہیں نہیں جاتا۔ کیسی یہ کیسی منطق ہے؟ اگر یہی اصول درست ہے تو فرمائیے کہ قرآن کریم کے اس مقام میں آپکا کیا استدلال ہوگا جہاں رسول کریم کی ازواج مطہراتؓ سے کہا ہے کہ:۔

مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ (۳۳:۳۱)
جو کوئی تم میں اللہ کی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کریگی تو ہم اس کو اس کا دہرا ثواب دیں گے۔

یعنی اگر وہ خدا و رسول کی فرمانبرداری کریں اور عمل صالح بھی کریں تو دہرا ثواب، لیکن اگر وہ (خدانخواستہ) خدا اور رسول کی فرمانبردار نہ بھی رہیں، اور اعمال صالح بھی نہ کریں، تو ان کو ثواب کا ایک حصہ تو ضرور مل جائیگا۔ ہے نا ٹھیک؟ اور اس منطق کو ذرا اور آگے بڑھائیے۔ فرمایا:۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (۳۳:۳۰)
اے نبی کی بیویو! جو کوئی تم میں سے کھلی ہوئی بیہودگی کریگی اسے دُہری سزا ملیگی۔

اُسی منطق کی رو سے معلوم ہوا کہ اگر ازواج مطہرات میں (نعوذ باللہ) کوئی بے حیائی کا کام کرے گی تو دہری سزا ملے گی۔ اور اگر ایسا نہ بھی کرے گی، تو بھی ایک حصہ سزا کا تو مل کر رہے گا سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون۔

حقیقت یہ ہے کہ ثواب و رحمت کا زیادہ حصہ لینا بعض حالات و شرائط کے تحت ہوتا ہے ایک کام آپ بلا کسی محنت و مشقت کے حسب معمول کر جائیں تو یقیناً اس کا اجر اتنا نہیں جتنا اس وقت کے عمل کا ہوگا جبکہ اس کے لیے اپنی جان خطرہ میں ڈال دی ہو۔ آپکے پاس دس ہزار روپیہ موجود ہو تو اس میں سے دس روپیہ خرچ کر دینے سے اللہ کی رحمتوں کا ہجوم اس کثرت سے نہ ہوگا جتنا اس حالت میں کہ آپ کے پاس صرف ایک پیسہ ہو، اور بھوک بھی لگ رہی ہو لیکن آپ اس کو بصد اشتہا کر لیں اور آپ سے زیادہ مستحق ہو کوئی سامنے آجائے اور آپ وہی اپنا سرمایہ اس کے حوالہ کر دیں۔ ازواج مطہرات کے اعمال حسنہ کا دگنا اجر اس لیے

ہے کہ انہوں نے دنیاوی آسائش و آرام کو دین کی خاطر ترک کرنا منظور کر لیا تھا، اور ان کے اعمال حیات کا اثر عام مسلمانوں پر بھی پڑتا تھا۔ اہل کتاب جب ایمان لائے ہیں تو انہیں بڑی بڑی سخت آزمائشوں سے گذرنا پڑا تھا۔ معتقدات انسان کے لیے سب سے زیادہ عزیز سرمایہ ہوتے ہیں۔ کفار و مشرکین کے معتقدات محض ان کے آبا و اجداد کی تقلید میں تھے۔ وہ انہیں کسی خاص حقانیت کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے برعکس اس کے عوام اہل کتاب اپنے معتقدات کو انبیاء و کتب سماوی کی طرف نسبت دیتے تھے، ان کے چھوڑنے میں قلب پر بڑا جبر کرنا پڑتا تھا۔ ان کے مذہبی مقتداؤں کے لیے یہ مرحلہ اور بھی زیادہ جانگسل تھا مذہب چھوڑنے سے ان کی "خدائی" ان کے ہاتھ سے نکل رہی تھی لیکن جنھوں نے اتنی بڑی آزمائشوں کا مقابلہ کیا، اور ایسی حالت میں مسلمان ہوگئے کہ اسلام قبول کرنے سے بظاہر دنیاوی مفاد بھی حاصل نہ ہو رہے تھے، ان کی جرأت ایمانی کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ یہ تمام حقیقت "بما صبروا" کے اندر مضمر ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید انکو دوہرے اجر کا مستحق قرار دیتا ہے۔

اب اس آیت کو لیجئے جو اس باب میں معترضین کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲:۸

تحقیق جو لوگ کہ ایمان والے ہیں۔ اور یہود اور نصاریٰ اور صابئین جو شخص بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور عمل اچھے کرے۔ ان کا اجر ان کے اللہ کے پاس ہے اور ان کو کسی قسم کا خوف و حزن نہیں۔

اس سے نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ و صابئین سے صرف ایمان باللہ و آخرت کا مطالبہ ہے۔ ایمان رسالت و قرآن کا مطالبہ نہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں ہمیں اب کسی مزید تفصیل و توضیح کی ضرورت نہیں۔ درحقیقت یہ آیت اور نتیجہ مستخرجہ اسی ضمن کا ہے جیسے ہم (۳: ۱۲) کی آیت میں دیکھ چکے ہیں۔

اور جس کا جواب بھی وہیں دیا جا چکا ہے مختصراً یہ کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ

۱۔ اہل کتاب کے ایمان باللہ و آخرت کو قرآن ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ (۹:۴)۔

۲۔ قرآن میں جہاں جہاں ایمان باللہ و آخرت کا مطالبہ ہے یہ اجمالی دعوت ہے جس کے اندر ایمان کے پانچوں اجزا شامل ہیں جن میں سے اگر ایک بھی ساقط ہو جائے تو ایمان باقی نہیں رہتا۔

۳۔ قرآن کسی عمل کو صالح قرار ہی نہیں دیتا تاوقتیکہ وہ ایسے ایمان کے ساتھ مشروط نہ ہو جیسا قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ اور یہ ایمان کیسا ہونا چاہیے اس کے متعلق قرآن کا حتمی فیصلہ ہے جسے بغور سن لینا چاہیے۔ فرمایا۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا	اور یہ کہتے ہیں کہ تم یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تب راہ
قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ	ہدایت پاؤ گے۔ کہدیجیے کہ نہیں بلکہ ہم تو ملت ابراہیم
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا	(پر رہینگے) ایک طرف ہو کر۔ اور وہ مشرک نہ تھے کہیے کہ
اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ اِلٰى اِبْرٰهٖمَ وَ	ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کتاب پر جو ہم پر نازل
اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ	کی گئی ہے اور جو کچھ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور
وَمَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَا اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ	اولاد یعقوب کی طرف نازل کیا گیا تھا اور جو موسیٰ اور
مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ۔	عیسیٰ اور تمام انبیاء کو دیا گیا ان کے رب کی طرف سے۔
وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ	ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ
مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ وَاِنْ	کے مطیع و منقاد ہیں۔ پس اگر یہ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں
تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ	جس طرح تم ایمان لائے ہو، تب وہ راہ ہدایت پر ہو لیں گے
اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (۲:۱۶)	اور اگر وہ روگردانی کریں تو وہ لوگ تو ہمیشہ سے مخالفت

پر ہی (رہے ہیں) سو عنقریب اللہ تمہاری طرف سے ان سے نمٹ لے گا اور وہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

ایمان کے متعلق صاف فیصلہ ہے کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ (اگر یہ لوگ ایسا ایمان لائیں جیسا تم لائے ہو) لہٰذا ایمان کا مطالبہ خواہ کسی طور سے کیا جائے جب تک وہ اس شرط پر پورا نہیں اترتا ایمان نہیں کہلایا جا سکتا۔

اور اگر (۲: ۶۰) کی رو سے یہی مانا جائے کہ صرف ایمان باللہ و یوم آخر کا ہی مطالبہ ہے تو اس میں تو یہود و نصاریٰ کے ساتھ ساتھ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (یعنی مسلمانوں) سے بھی یہی مطالبہ ہے یعنی جس طرح یہود و نصاریٰ صرف اللہ و آخرت پر ایمان رکھتے ہوئے جس شرع و منہاج پر جی چاہے کاربند رہیں نجات کے مستحق ہو جائیں گے اسی طرح مسلمان بھی محض اللہ و آخرت پر ایمان رکھتے ہوئے جس طریق پر جس طرح جی چاہے کاربند ہو جائیں نجات کے لیے کافی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر قرآن و رسول کا اتباع کن کے لیے ضروری ٹھیرا؟ اس آیت میں صرف اسلام کی عالمگیر دعوت و تبلیغ کا ذکر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر ملت کا انسان اس دائرہ میں داخل ہو سکتا ہے کسی کے لیے اس کی نسل، رنگ، قومیت، مذہب، اس بارہ میں مانع نہیں نہ یہ کہ ہر فرقہ اپنے اپنے وہم و قیاس کے مطابق عمل پیرا ہونے سے مساوی نجات کا مستحق ہو سکتا ہے۔

حکایت دراز تر ہو گئی لیکن اسے ختم کرنے سے پیشتر ایک اور عقیدہ کا اظہار کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا پنجاب کے ایک صاحب کا دعویٰ ہے (اور ایسی ایسی جدتوں کے لیے پنجاب ہی کی سرزمین کچھ زیادہ راس ہے شهادة من اهلها) کہ رسول اللہ کی رسالت صرف عرب کے بنی اسمٰعیل کے لیے تھی۔ باقی دنیا کے لیے وہ بطور مجدد کے تھے (ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ "یہ رسول مجدد" کی ترکیب قرآن پر کتنا حسین اضافہ ہے)۔ اپنے دعوے کی دلیل میں قرآن کریم سے ایسی آیات پیش کرتے ہیں جن میں نبی اکرم سے کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کو ڈرا دیجیے جن کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا مثلاً۔

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ لِتُنْذِرَ قَوْمًا (یہ قرآن) خدائے عزیز الرحیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے

أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ (۳۶:۱) کہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے آباؤ اجداد نہیں ڈرائے گئے تھے۔

یا یہ آیت۔

وَهَٰذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ أَن تَقُولُوا إِنَّمَا أُنزِلَ الْكِتَابُ عَلَىٰ طَائِفَتَيْنِ مِن قَبْلِنَا وَإِن كُنَّا عَن دِرَاسَتِهِمْ لَغَافِلِينَ۔ أَوْ تَقُولُوا لَوْ أَنَّا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْكِتَابُ لَكُنَّا أَهْدَىٰ مِنْهُمْ فَقَدْ جَاءَكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ .... (۲:۶)

اور یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے اتارا ہے بڑی خیر و برکت والی ہے سو اس کا اتباع کرو، اور ڈرو تاکہ تم پر رحمت ہو۔ کبھی تم لوگ یہ کہنے لگتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے جو دو فرقے تھے ان پر نازل ہوئی تھی اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے محض غافل تھے یا یوں کہتے کہ اگر ہم پر کوئی کتاب نازل ہوتی تو ہم ان سے بھی زیادہ راہ راست پر ہوتے سو اب تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح کتاب رہنما اور رحمت آگئی ....

ان آیات سے ثابت کیا جاتا ہے کہ چونکہ بنی اسرائیل کے پاس پہلے کتابیں آچکی تھیں اس لیے قرآن کریم صرف بنی اسمٰعیل کے لیے ہی نازل ہوا ہے (حقیقت یہ ہے کہ فکر انسانی کی بلند پروازی کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ جو نتائج چاہے مستخرج کرے) خیر گذری جو ان کی نگاہ اس آیت پر نہ پڑی۔

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ۔ (۲۶:۱۱) اور اپنے کنبہ کے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے۔

اس سے تو وہ حضورؐ کی رسالت کو صرف آپ کے خاندان تک ہی محدود کر دیتے اور باقی ساری دنیا کے لیے آپ کو "مجدد" قرار دے لیتے۔

قرآن کریم نے تبلیغ کے مختلف مدارج دکھائے ہیں دعویٰ نبوت کے بعد سب سے پہلے اپنے خویش اقارب ہی مخاطب کیے جا سکتے تھے ؎۔ چنانچہ یہ تبلیغ کا پہلا درجہ ہے۔

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (۲۶:۱۱) اور اپنے کنبے کے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے۔

پھر یہ دائرہ ذرا اور وسیع ہوا اور فرمایا۔

کَذٰلِکَ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَہَا (۴۲:۱)۔ اور ہم نے عربی قرآن بذریعہ وحی کے تیری طرف بھیجا کہ تو مکے اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو ڈرائے۔

پھر اس حلقہ میں اور وسعت ہوئی۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اُنْذِرَ اٰبَاۗؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۔ (۳۶:۱) تاکہ تو ان لوگوں کو ڈرائے جن کے آباواجداد نہیں ڈرائے گئے تھے اس لیے وہ بے خبر ہیں۔

پھر ان کے ساتھ اہل کتاب بھی شامل ہوئے۔

یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰي فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَاۗءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ (۵:۳) اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا رسولوں کی غیر موجودگی میں تاکہ کہیں تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی خوش خبری دینے والا اور آگاہ کرنے والا نہیں آیا۔ (سو تمہارے پاس بشیر و نذیر آگیا)۔

دیکھ لیجیے۔ اس میں اہل کتاب کے لیے بھی اسی حجت کا ذکر کیا گیا ہے جو غیر اہل کتاب "بنی اسمٰعیل" کے لیے ہمارے معترض نے (۶:۲۰) میں ظاہر کی تھی نیز عَلٰی فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ رسولوں کی غیر موجودگی سے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ نبی اکرمؐ کی بعثت کے وقت کسی نبیؑ کا صحیح پیغام کہیں موجود نہ تھا کیونکہ رسول کے پیغام کا موجود رہنا درحقیقت رسول کا موجود رہنا، اور اس کے پیغام کا گم ہو جانا خود رسول کا گم ہو جانا ہے۔ نبی اکرمؐ کی رسالت اسی وجہ سے قیامت تک کے لیے ہے کہ ان کا پیغام قیامت تک کے لیے محفوظ و مصئون ہے۔

پھر یہ دائرہ اپنی انتہائی وسعتوں تک پہنچ گیا اور حضورؐ کی دعوت تمام اہل عالم کے لیے بیان کی گئی۔

قُلْ يٰٓاَيُّھَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَۨا (۷:۲) کہہ دو اے محمدؐ کہ لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں

دوسری جگہ ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (۳۴:۳) — اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بناکر بھیجا ہے۔

نہ صرف اسی زمانہ کے مخاطبین کے لیے ہی بلکہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے بھی

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (۶۲:۱) — وہی ہے جس نے انپڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو آیتیں سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے، اور ان لوگوں کی طرف بھی جو ابھی تک ان میں نہیں ملے ہیں۔

آپ فرمائیے کہ رسولؐ کی رسالت تمام نوع انسانی کے لیے ہے یا صرف بنی اسمٰعیل کے لیے؟ اور اتنی بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے۔

یہ حقائق کسی مزید تبصرے کے محتاج نہیں نہ یہ کچھ ایسی باتیں ہیں کہ کوئی شخص جو تلاش حق کے خاطر ان کا مطالعہ کرے اس پر صحیح مطلب واضح نہ ہو۔ باوجود اس کے کچھ لوگ یہی عقیدہ رکھے چلے جاتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہر گروہ اپنے اپنے طریق پر کاربند رہ کر نجات حاصل کر سکتا ہے۔

آپ خود فیصلہ فرما لیجیے کہ اس عقیدہ کو قرآن کریم کی تعلیم سے کس قدر مناسبت ہے۔ میں خود ایک عرصہ تک حیران رہا کہ ایسے عقیدہ کا محرک کونسا جذبہ ہے اور وہ کونسی ایسی دلیل ہے جو ان کے نزدیک قرآنی حقائق پر بھی فائق ہے؟ ایک دفعہ ایک اچھے معقول مسلمان صاحب سے اسی عنوان پر گفتگو ہو رہی تھی میں نے قرآن پاک کی بہی آیات کوشش کیا (دہرا دہرا کر) باتوں کے بعد فرمانے لگے کہ صاحب کچھ بھی ہو یہ تو انتہائی

تنگ نظری ہے کہ قرآن یا محمد رسول اللہ نجات وسعادت محض اپنے ہی طریقہ تعلیم کے ساتھ مشروط کردیں اور باقی دنیا کے تمام مذاہب کو باطل قرار دیدیا جائے"۔ اس کے بعد یہی دلیل مختلف الفاظ میں مختلف احباب سے سننے میں آئی۔ آپ نے کچھ خیال فرمایا کہ اس خیال کی بنیاد کس عقیدہ پر ہے؟ ان حضرات نے دین کو بھی ایک دنیاداری کا معاملہ سمجھ رکھا ہے یوں سمجھیے کہ ان کے نزدیک (نقل کفر کفر نباشد) مختلف حضرات انبیاء کرام اپنی اپنی جنس لے کر منڈی میں آئے ہوئے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک اپنی تجارت کے لیے اپنے متبعین بڑھانے کی خاطر اپنی جنس کو سب سے عمدہ اور خالص بتاتا ہے چنانچہ یہی آواز قرآن کی دکان سے بھی ان تک پہنچتی ہے، اور یہ بات واقعی نہایت تنگ نظری کی ہے کہ اپنے مذہب کے فروغ کی خاطر قرآن باقی تمام ادیان عالم کے پیرؤں کے لیے نجات کے دروازے بند کردے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہر دکان میں وہی سودا بکتا ہے جس کا جہاں سے جی چاہے سودا خریدے تم دوسروں کا "منافع" مارنے کی خاطر ان کی جنس کو کھوٹی کیوں بتاتے ہو۔

یہ دلیل بڑی محکم اور خوش آیند معلوم ہوتی ہے لیکن صرف دنیاوی تجارت کے بازار تک ہی اس کا اطلاق درست ہے جہاں ہر شخص کی دکان مختلف ہوتی ہے! اور اس دکان کے نفع و نقصان کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے۔ برعکس اس کے مذہب کے متعلق یہ نقشہ نہایت مضبوطی کے ساتھ دل میں تسلیم کرلینا چاہیے کہ مذہب اسلام حضرت آدم سے لے کر نبی اکرم تک ہر زمانے میں خدا اور صرف خدا کی طرف سے آتا رہا ہے اس دکان کا وہ واحد مالک ہے حضرات انبیاء کرام کا اس میں کوئی ذاتی حصہ نفع یا نقصان نہیں ہوتا۔ یہ انتظام بھی اسی مالک حقیقی کا ہے کہ اپنی ایک ایجنسی کو بند کردے کہ وہاں کے کارندوں نے بددیانتی شروع کردی تھی، اور اصل مال میں کچھ ملاوٹ کرکے گاہکوں کو دھوکہ دیتے تھے، اور اس کی جگہ دوسری ایجنسی کھول دے۔ اگر یہی مالک۔۔۔ اس قسم کا اشتہار دے کہ میری فلاں فلاں ایجنسی قابل اعتماد نہیں۔۔۔ خریدار دو۔۔۔ مطلع کیا جاتا ہے کہ اصلی مال۔۔۔ مال اب فلاں ایجنسی سے ہی ملا کریگا، تو فرمائیے اس ایجنسی کے ۔۔۔ کیا

تنگ نظری ہے۔ اور مالک حقیقی کی کونسی جانب داری ہے۔ سند اس نئی ایجنسی کے پاس یہ ہے کہ دوسری دکانیں اس مال پر جسے وہ اصل بتاکر پیش کر رہی ہیں، مالک حقیقی کی مہر نہیں دکھا سکتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ہے یہ تمام غلط فہمیاں مقام رسالت کی صحیح تحقیق نہ کرنے کی بنا پر ہیں۔ اگر رسول کو اللہ کا پیغمبر اور قرآن کو خدا کا کلام سمجھا جائے تو اس تنگ نظری کا الزام کس پر ہو؟ تنگ نظری کا تو سوال ہی وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں ہم مذہب اسلام کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دماغ کی تخلیق قرار دیدیں۔ اور یقین مانیے کہ ہمارے تجدد پسند، روشن خیال حضرات، خواہ زبان سے اس کا اقرار نہ بھی کریں لیکن جس قسم کے شبہات ان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، وہ صاف صاف بتا رہے ہیں کہ وہ رسول اللہ کو صرف ایک "راستباز انسان" ہی سمجھتے ہیں "مامور من اللہ" نہیں سمجھتے اور اسی بنا پر وہ تمام خیالات پیدا ہو رہے ہیں جنہیں رواداری، کشادہ دلی، وسعت ظرف وغیرہ کے نظر فریب مناظر میں چھپا کر سامنے لایا جاتا ہے بعض دیدہ و دانستہ لیکن اکثر ان میں سے خود بھی دھوکے میں ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ بظاہر معلوم نہیں ہوتا لیکن یہ خیالات بھی اس مسموم فضا کا نتیجہ ہیں جو انہیں آہستہ آہستہ قرآن و رسول سے بالکل بیگانہ کرتی چلی جا رہی ہے اور ہم رفتہ رفتہ اپنے مرکز سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ یہ آواز جب تک عام بازاری حلقوں سے اٹھتی رہی، زیادہ اعتبار اور قوت حاصل نہ کر سکی لیکن وا حسرتا! کہ بعض نہایت ممتاز اور ذمہ دار ہستیوں کی طرف سے بھی اس قسم کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ آج مختلف گوشوں سے جو عام طور پر ایمان بالرسالت کے خلاف اعتراضات پیدا ہو رہے ہیں، یہ انہی آوازوں کی صداہائے بازگشت ہیں۔ اس باب میں اس "موقر جریدہ" کو مؤقر مجلہ معارف سے بھی تھوڑا سا گلہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ کی کتاب ترجمان القرآن پر اس عاجز نے جب تنقید لکھی اور اس میں ظاہر کیا کہ ترجمان سے اس قسم کے خیالات کی اشاعت ہو رہی ہے جن سے رواداری کے مقابلہ میں ایمان بالرسالت کی کوئی قیمت نہیں رہتی، تو اس کے بعد معارف میں اس عنوان پر ایک مبسوط مقالہ مدیر معاون معارف کے قلم سے شائع ہوا۔ اگرچہ اس میں راقم الحروف کے اعتراضات سے

اصولاً اتفاق کیا گیا تھا لیکن مضمون کچھ ایسا بیچ بچا کر "سمٹ سمٹا کر منہ موڑ کر ادھر کو اُدھر کو بڑھا کے ہاتھ" لکھا گیا تھا کہ جس سے :۔

گاندھی جی بھی خوش رہیں۔ راضی رہے سرکار بھی

حتیٰ کہ آخر میں بحث کا خلاصہ لکھتے وقت یہ تحریر تھا کہ ۔

"قرآن پاک نے اہل کتاب کو سب سے پہلے اس عالمگیر صداقت کے دین کو جو اسلام کا مرادف ہے اور جس کو اسلام کہتے ہیں، ماننے کی دعوت دی ہے تاکہ وہ کامل ہدایت پائیں، لیکن اگر وہ اس کو نہ مانیں تو دوسری دعوت اصل مقصد سے اتر کر بر سبیل تنزل یہ دی ہے کہ وہ اپنے ہی مذہب پر پوری طرح عمل کریں تو ان سے بھی اسلام پورا نہیں تو اسلام کا قرب تو حاصل ہوگا"۔ (معارف بابت مارچ ۱۹۳۳ء، صفحہ ۱۹۵)

صاحب مضمون نے اپنے مقالہ میں کہیں کوئی ایسی دلیل پیش نہیں کی جس سے وہ نتیجہ نکالا جا سکتا جو ہوں نے بحث کے آخر میں نکالا ہے۔ اس لیے میں تو حیران ہوں کہ یہ "بر سبیل تنزل"، اصل مقصد سے اتر کر، دوسری دعوت قرآن کے کس مقام سے ثابت ہے؟ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ جہاں تک ہدایت وضلالت کا تعلق ہے قرآن نے انسان کے لیے دو اور صرف دو ہی راستے بتائے ہیں: ظلمت و نور، کفر و ایمان، ضلالت و ہدایت۔ ان کے بین بین، کوئی اور راہ قرآن کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (گمراہی اور ہدایت بالکل واضح ہو چکی ہے)۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا۔ (ہم نے اس کو راستہ دکھا دیا، خواہ وہ اب قبول کرے، خواہ اس سے انکار کر دے) وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (ہم نے اس کو دونوں راستے بتا دیے ہیں)۔ اسلام تو نام ہی دو ٹوک ہو جانے کا ہے اس لیے اسے دین حنیف (سب سے کٹ کر ایک ہو جانے کا دین) کہا گیا ہے۔ اس کے بین بین تو صرف منافقت کا راستہ ہے۔ قرآن کا تو فیصلہ ہے کہ ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَ	جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ	اور یوں چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان

وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ — تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے
وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا — ہیں اور بعض کے منکر ہیں، اور یوں چاہتے ہیں کہ بین بین
أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا۔ (۴:۲۱) — ایک راہ تجویز کریں ایسے لوگ پکے کافر ہیں۔

کیا اہل کتاب کو بہ سبیل تنزل جس قسم کے ایمان کی دعوت معارف میں دی گئی ہے۔ وہ یہی نہیں کہ

(۱) بعض رسولوں پر ایمان رکھیں اور بعض پر نہ رکھیں۔ اور

(۲) کفر اور اسلام کے بین بین ایک راہ تجویز کریں۔

اور کیا یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر ان اہل کتاب کو قرآن میں کافرون حقاً (پکے کافر بلا شک وشبہہ کافر) کہا گیا ہے؟ نہ معلوم اس سے اسلام کا قرب کس طرح سے حاصل ہوگا؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ "اُن کے اپنے ہی مذہب پر پوری طرح عمل کرنے" سے مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی اصلی تعلیم، حقیقی کتاب پر کاربند ہو جائیں، تو وہ اصلی تعلیم لیں گے کہاں سے؟ اگر آپ اس کے وجود کے قائل ہیں تو پیدا کیجیے۔ قرآن کا دعویٰ تو یہی ہے کہ ان کے پاس ان کی اصلی تعلیم موجود ہی نہیں۔ اور ان کی تحریف کے آپ خود قائل ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے کہ۔

> لیکن قرآن کے اس کہنے سے (جو اقتباس اوپر نقل کیا گیا ہے۔ اس کہنے سے) یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن نے یہودیت اور نصرانیت اور ان کی تحریف شدہ کتابوں کی صداقت کو تمام تر تسلیم کر لیا ہے (ایضاً ص ۱۹۵)

اگر وہ اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے سے بھی اسلام کے قریب آسکتے ہیں، تو آپ کے اس ٹکڑے سے کیا مطلب ہے کہ:۔

"پس نتیجہ بحث یہ ہے کہ۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ — اور ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری سنانے

بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ والا اور ہوشیار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن بہت سے لوگ بے خبر ہیں ۔ (الیضاً صفحہ ۱۹۵

نتیجہ بحث تو بالکل یہی ہے لیکن اس میں یہ داخل نہیں کہ اہل کتاب اپنے اپنے مذہب پر کاربند رہ کر بھی اسلام کا قرب حاصل کر سکتے ہیں۔ نزول قرآن و بعثت نبوی کے بعد دنیا کا کوئی انسان کسی اور طریق پر کاربند رہ کر ہدایت و نجات کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا کہ یہ فیصلہ اس کا ہے جو نجات و ہدایت کی تمام راہوں کا مالک ہے کسی انسان کا فیصلہ نہیں ہے ۔ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ شَهِيْد۔

اسلام اور ضبط ولادت

چند سال سے ہندوستان میں ضبط ولادت (Birth Control) کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ اس کی تائید میں نشر و اشاعت کرنے، اور لوگوں کو اس کی طرف رغبت دلانے، اور اس کے عملی طریقوں کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لیے انجمنیں قائم ہو چکی ہیں، اور رسالے شائع کیے جا رہے ہیں۔ لکھنو میں عورتوں کی آل انڈیا کانفرنس نے اس کی حمایت میں قرارداد منظور کی۔ کراچی اور بمبئی کی مجالس بلدیہ میں اس کی عملی تعلیم رائج کرنے پر بحث کی گئی۔ میسور، مدراس، اور بعض دوسرے مقامات پر خاص اسی غرض کے لیے (Clinics) قائم کیے جا چکے ہیں۔ لندن کے برتھ کنٹرول انٹرنیشنل انفارمیشن سنٹر کی ڈائرکٹر مسز ایڈتھ ہو مارٹن (Mrs. Edith How Martyn) ہندوستان میں اس تحریک کی نشر و اشاعت کے لیے دورہ کر رہی ہیں۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے کمشنر ڈاکٹر ہٹن (Hutton) نے اپنی رپورٹ میں ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو خطرناک ظاہر کر کے ضبط ولادت کی ترویج پر زور دیا ہے۔ ان سب کے بعد حال میں کونسل آف اسٹیٹ کے ایک مسلمان ممبر نے حکومت کو توجہ دلائی ہے کہ وہ ہندوستان میں آبادی کی افزائش کو روکنے کے لیے عملی تدابیر اختیار کرے۔ اگرچہ حکومت ہند نے اس وقت اس تجویز کو رد کر دیا ہے لیکن اندیشہ ہے کہ اگر اسی رفتار کے ساتھ ضبط ولادت کی تائید میں رائے عام کی قوت بڑھتی رہی، تو ایک دن شاردا ایکٹ کی طرح یہ مصیبت بھی ہندوستان پر مسلط ہو جائے گی۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی جائے، خصوصاً اس وجہ سے کہ حکومت کے سامنے اس تجویز کو پیش کرنے والے ایک مسلمان صاحب ہیں، جنھیں قوم نے منتخب کر کے اپنی نمائندگی

کے لیے کونسل آف اسٹیٹ میں بھیجا ہے اور ان صاحب نے اپنی تقریر میں حکومت کو یقین دلایا ہے کہ "کوئی مذہب ضبط ولادت کی راہ میں مانع نہیں ہے"۔ اس کے بعد اگر اسلامی قوانین کا علم رکھنے والے خاموش رہیں تو عام طور پر یہ گمان کر لیا جائے گا کہ اسلام ضبط ولادت کی تحریک کا حامی ہے، یا کم از کم اس کو جائز رکھتا ہے۔

قبل اس کے کہ اس مسئلہ پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی جائے، یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ضبط ولادت کی تحریک کیا ہے؟ کس طرح شروع ہوئی؟ کن اسباب سے اس نے ترقی کی؟ اور جن ممالک میں اس نے رواج پایا وہاں اس کے کیا نتائج رونما ہوئے؟ جب تک یہ مقدمات اچھی طرح ذہن نشین نہ ہو جائیں گے، شرع اسلام کا فتویٰ ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہ آئے گا، نہ دل اس پر مطمئن ہو سکیں گے۔

تحریک ضبط ولادت کا مقصد

ضبط ولادت کا اصل مقصد نسل کی افزائش کو روکنا ہے۔ قدیم زمانے میں اس کے لیے اسقاط حمل، قتل اولاد، اور برہم چرج (ضبط نفس خواہ وہ تجرد کی شکل میں ہو یا تاہل کے باوجود مقاربت سے پرہیز کی شکل میں) کے طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔ آج کل موخر الذکر دونوں طریقوں کو ترک کر دیا گیا ہے، اور ان کے بجائے یہ طریقہ ایجاد ہوا ہے کہ مقاربت تو کی جائے، مگر دواؤں یا آلات کے ذریعہ سے استقرار حمل کو روک دیا جائے۔ اسقاط حمل کا طریقہ بھی کثرت کے ساتھ یورپ اور امریکہ میں رائج ہے لیکن برتھ کنٹرول کی تحریک صرف مانع حمل تدابیر پر زور دیتی ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ان تدابیر کا علم اس قدر عام کر دیا جائے، اور ان کے ذرائع اس کثرت کے ساتھ فراہم کیے جائیں کہ ہر بالغ مرد و عورت ان سے فائدہ اٹھا سکے۔

تحریک کی ابتدا

یورپ میں اس تحریک کی ابتدا اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہوئی۔ اس کا پہلا محرک غالباً انگلستان کا مشہور ماہر معاشیات، مالتھوس (Malthus) تھا۔ اس کے عہد میں انگریزی قوم کی روز افزوں خوش حالی کے سبب سے انگلستان کی آبادی تیزی کے ساتھ بڑھنی شروع ہوئی۔ آبادی کی اس توفیر کو دیکھ کر اس نے حساب لگایا کہ زمین پر قابل سکونت جگہ محدود ہے، اور اسی طرح معیشت کے وسائل بھی محدود ہیں لیکن نسل کی افزائش غیر محدود ہے۔ اگر نسل اپنی فطری رفتار کے ساتھ بڑھتی رہے تو

زمین اس کے لیے تنگ ہو جائے گی وسائل معاش کفایت نہ کر سکیں گے، اور افزائش نسل کے ساتھ معیارِ زندگی پست ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا نسل انسانی کی خوشحالی آسایش اور فلاح وبہبود کے لیے ضروری ہے کہ اس کی افزایش، وسائل معاش کی وسعت کے ساتھ متناسب رہے اور اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ اس غرض کے لیے اس نے برہم چرج کے قدیم طریقے کو رائج کرنے کا مشورہ دیا یعنی بڑی عمر میں شادی کی جائے۔ اور تأہل کی زندگی میں ضبط نفس سے کام لیا جائے۔ یہ خیالات پہلی مرتبہ ۱۷۹۸ء میں اس نے اپنے ایک رسالہ (An Essay on Population as it Effects the Future Improvement of Society) میں پیش کیے تھے۔

اس کے بعد فرانسس پلاس (Francis Place) نے فرانس میں افزائش نسل کو روکنے کی ضرورت پر زور دیا مگر اس نے اخلاقی ذرائع کو چھوڑ کر دواؤں اور آلات کے ذریعے منع حمل کی تجویز پیش کی۔ اس رائے کی تائید امریکہ کے ایک مشہور ڈاکٹر چارلس نولٹن (Charles Knowlton) نے ۱۸۳۳ء میں کی۔ اس کی کتاب ثمرات فلسفہ (The Fruits of Philosophy) غالباً پہلی کتاب ہے جس میں منع حمل کے طبی طریقوں کی تشریح کی گئی تھی، اور ان کے فوائد پر زور دیا گیا تھا۔

ابتدائی تحریک کی ناکامی اور اس کا سبب

ابتدا میں اہل مغرب نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اس لیے کہ نظریہ اصلاً غلط تھا۔ مالتھوس حساب لگا کر یہ تو دیکھ سکتا تھا کہ آبادی کس رفتار سے بڑھتی ہے لیکن اس کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وسائل معاش کس رفتار سے بڑھتے ہیں، اور زمین میں قدرت کے کتنے خزانے پوشیدہ ہیں جو علم کی ترقی، عقل کی کارفرمائی اور عمل کی قوت سے نکلتے چلے آتے ہیں اور انسان کے وسائل معاش میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کا تصور معاشی ترقی کے ان امکانات

تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا جو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے، اور اس کے بعد قوت سے فعل میں آئے انیسویں صدی کے ربع آخر تک یورپ کی آبادی تیزی کے ساتھ بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ۷۰ سال کے اندر قریب قریب دوگنی ہوگئی۔ خصوصاً انگلستان کی آبادی میں تو حیرت انگیز اضافہ ہوا جس کی مثال نسل انسانی کی تاریخ میں نہیں ملتی ۱۷۸۹ء میں اس ملک کی آبادی ۱۲ ملین تھی ۱۸۹۰ء میں ۳۸ ملین تک پہنچ گئی لیکن اس اضافہ کے ساتھ ساتھ معاشی وسائل میں بھی زبردست ترقی ہوئی صنعت و تجارت میں یہ ممالک تمام دنیا کے اجارہ دار ہوگئے۔ ان کی زندگی کا انحصار خود اپنی زمین کی پیداوار پر نہ رہا۔ بلکہ وہ اپنی مصنوعات کے معاوضہ میں دوسرے ممالک سے سامان غذا حاصل کرنے لگے، اور نسل کی زبردست افزائش کے باوجود ان کو کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ زمین ان کی بڑھتی ہوئی نسلوں کے لیے تنگ ہوگئی ہے، یا قدرت کے خزانے ان کی افزائش نسل کا ساتھ دینے سے انکار کر رہے ہیں۔

جدید تحریک | انیسویں صدی کے ربع آخر میں ایک نئی تحریک اٹھی جو نومالتھوسی تحریک Neo-Malthusian Movement کہلاتی ہے۔ ۱۸۷۶ء میں مسز اینی بیسنٹ اور چارلس بریڈلانے ڈاکٹر نولٹن کی کتاب "ثمرات فلسفہ" کو انگلستان میں شائع کیا۔ حکومت نے اس پر مقدمہ چلا دیا، اور مقدمہ کی شہرت نے عوام کو اس تحریک کی طرف متوجہ کر دیا۔ ۱۸۷۷ء میں ڈاکٹر ڈریسڈیل (Drysdale) کے زیر صدارت ایک انجمن قائم ہوگئی جس نے ضبط ولادت کی تائید میں نشر و اشاعت شروع کر دی۔ اس کے دو سال بعد مسز بیسنٹ کی کتاب قانون آبادی (Law of Population) شائع ہوئی جس کے ایک لاکھ چھتر ہزار نسخے پہلے ہی سال فروخت ہوگئے۔ ۱۸۸۱ء میں تحریک ہالینڈ، بلجیم، فرانس اور جرمنی میں پہنچی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ یورپ اور امریکہ کے تمام متمدن ممالک میں پھیل گئی۔ باقاعدہ انجمنیں قائم ہوئیں جنہوں نے تحریر و تقریر کے ذریعہ سے لوگوں کو ضبط ولادت کے فوائد اور اس کے عملی طریقوں سے آگاہ کیا، اس کو اخلاقی نقطہ

نظر سے جائز بلکہ مستحسن، اور معاشی نقطۂ نظر سے مفید بلکہ قطعاً ناگزیر بتایا گیا اس کے لیے دوائیں ایجاد کی گئیں آلات بنائے گئے عام لوگوں کی دست رس تک ان چیزوں کو پہونچانے کا انتظام کیا گیا اور جگہ جگہ (Birth Control Clinics) قائم کیے گئے جہاں عورتوں اور مردوں کو ضبط ولادت کے لیے ماہرانہ مشورے دیے جانے لگے۔ اس طرح اس نئی تحریک نے بہت جلدی فروغ پا لیا، اور اب روز بروز ترقی کی جا رہی ہے۔

ترقی کے اسباب | دور جدید میں اس تحریک کے پھیلنے کی اصلی وجہ وہ نہیں ہے جس کی بنا پر ابتدا میں مالتھوس نے افزائش نسل کو روکنے کا مشورہ دیا تھا بلکہ دراصل یہ نتیجہ ہے مغرب کے جدید صنعتی انقلاب (Industrial revolution) اور سرمایہ دارانہ نظام اور مادہ پرست تہذیب اور نفس پرست تمدن کا۔ آئیے اب ہم ان اسباب میں سے ایک ایک پر نظر ڈالکر دیکھیں کہ اس نے مغربی قوموں کو کس طرح ضبط ولادت پر مجبور کیا ہے۔

۱۔ انقلاب صنعتی | یورپ میں جب مشین ایجاد ہوئی، اور مشترک سرمائے سے بڑے بڑے کارخانے قائم ہو کے کثیر پیدآوری (Mass-Production) کا سلسلہ شروع ہوا تو دیہات کی آبادیاں کھیتی باڑی کو چھوڑ کر کارخانوں میں کام کرنے کے لیے شہروں کی طرف آنے لگیں، یہاں تک کہ دیہات اجڑ گئے اور بڑے بڑے عظیم الشان شہر وجود میں آئے جہاں لکھوکھا آدمی ایک محدود جگہ میں مجتمع ہو گئے۔ اس چیز نے ابتدا میں یورپ کی خوشحالی کو خوب بڑھایا لیکن بعد میں اس نے بے شمار معاشی مشکلات پیدا کر دیں۔ زندگی کے لیے جد و جہد بڑھ گئی۔ مقابلہ سخت ہو گیا۔ معاشرت کا معیار بلند ہوا۔ ضروریات زندگی نے وسعت اختیار کی اور ان کی قیمتیں اتنی بڑھ گئیں کہ محدود آمدنی رکھنے والوں کے لیے اپنی خواہشات کے مطابق اپنی معاشرت کے بلند معیار کو قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ مکانات کی جگہ کم اور کرائے زیادہ ہو گئے۔ کمانے والوں کے لیے کھانے والوں کا وجود دوبھر ہونے لگا یا

کے لیے اولاد اور شوہروں کے لیے بیویوں تک کی پرورش ناقابل برداشت بار بن گئی۔ اور ہر شخص مجبور ہوا کہ اپنی آمدنی کو صرف اپنی ذات پر خرچ کرے، اور دوسرے حصہ داروں کی تعداد جہاں تک ممکن ہو گھٹا دے۔

۲۔ عورتوں کا معاشی استقلال ان حالات میں عورتوں کو مجبوراً اپنی آپ کفالت کرنا اور خاندان کے کمانے والے افراد میں شامل ہونا پڑا۔ معاشرت کی تدیم اور فطری تقسیم عمل جس کی رو سے مرد کا کام کمانا اور عورت کا کام گھر کا انتظام کرنا ہے، باطل ہو گئی۔ عورتیں کارخانوں اور دفتروں میں خدمت کرنے کے لیے پہنچ گئیں، اور جب کسب معیشت کا بار ان کو سنبھالنا پڑا، تو اُن کے لیے ناممکن ہو گیا کہ افزائش نسل اور پرورش اطفال کی اُس خدمت کو بھی اس کے ساتھ ساتھ ادا کرسکیں جو فطرت نے ان کے سپرد کی تھی۔ ایک عورت جس کو اپنی ضروریات فراہم کرنے، یا گھر کے مشترک بجٹ میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لیے روزانہ کام کرنا ضروری ہے کسی طرح اس بات پر آمادہ نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس حالت میں بچے بھی پیدا کرے۔ زمانہ حمل کی تکالیف اکثر عورتوں کو اس قابل نہیں رکھتیں کہ وہ گھر کے باہر کچھ زیادہ جسمانی یا دماغی محنت کرسکیں، خصوصاً حمل کے آخری زمانے میں تو ان کے لیے بیکار رہنا ضروری ہے۔ پھر وضع حمل اور اس کے بعد کچھ مدت تک بھی وہ کام کرنے کے قابل نہیں ہوسکتیں اس کے بعد بچے کو دودھ پلانا اور کم از کم تین چار سال تک اس کی نگرانی حفاظت اور تربیت کرنا ایسے حالات میں کسی طرح ممکن نہیں۔ نہ تو ماں اپنے شیر خوار بچے کو دفتر یا کارخانے میں لے جاسکتی ہے۔ نہ اپنی قلیل معاش میں اتنی گنجایش نکال سکتی ہے کہ بچہ کی نگہداشت کے لیے نوکر رکھ لے۔ اور اگر وہ اپنے ان فطری وظائف کو انجام دینے کے لیے ایک کافی عرصہ تک بیکار رہے تو بھوکی مرجائے، یا شوہر کے لیے ناقابل برداشت بار بن جائے اس کے علاوہ جس کی وہ ملازم ہے، وہ بھی گوارا نہیں کرسکتا کہ وہ بار بار کئی کئی مہینے کے لیے رخصت لیتی رہے۔ غرض ان اسباب سے عورت اپنی فطری خدمت سے اعراض کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے

اور پیٹ کی ضروریات اس کے اُن زبردست جذبات کو سرد کردیتی ہیں جو فطرت نے بچوں کے لیے اس کے سینے میں ودیعت کیے ہیں۔

۲- جدید تہذیب و تمدن | جدید تہذیب و تمدن نے بھی ایسے اسباب فراہم کر دیے ہیں۔ جو افزائش نسل سے عام نفرت پیدا کرنے والے ہیں۔

مادہ پرستی نے لوگوں میں انتہا درجے کی خود غرضی پیدا کر دی ہے ہر شخص اپنی آسائش کے لیے زیادہ سے زیادہ اسباب فراہم کرنا چاہتا ہے اور پسند نہیں کرتا کہ اس کے رزق میں کوئی دوسرا حصہ لے خواہ وہ اس کا باپ بھائی، بہن، بیوی حتیٰ کہ اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

دولت مندوں نے نفس پرستی کے لیے عیش و عشرت کے بے شمار طریقے اور سامان ایجاد کر دیے ہیں جن کو دیکھ دیکھ کر اوسط اور ادنیٰ درجہ کے لوگ بھی ان کی ریس کرنا چاہتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے اسباب عیش لوگوں کے لیے لوازم حیات بن گئے ہیں اور لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان چیزوں کے بغیر وہ کسی طرح جی ہی نہیں سکتے اس چیز نے معاشرت کے معیار کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ ایک قلیل المعاش آدمی کے لیے خود اپنے نفس کے بھی تمام مطالبات کو پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے، کجا کہ وہ بیوی اور اولاد کی ضروریات کا بھی کفیل ہو سکے۔

عورتوں میں تعلیم، آزادی، اور مردوں کے ساتھ آزادانہ اختلاط نے ایک نئی ذہنیت پیدا کر دی ہے جو فطری وظائف سے ان کو روز بروز منحرف کرتی چلی جا رہی ہے وہ گھر کی خدمت اور بچوں کی پرورش کو ایک گھناؤ نا کام سمجھتی اور اس سے جی چراتی ہیں۔ ان کو دنیا کی ہر چیز سے دلچسپی ہے مگر نہیں ہے تو گھر اور اس کے کام کاج اور بچوں کی نگہداشت سے۔ بیرون خانہ کے لطف چھوڑ کر اندرون خانہ کی تکلیفیں برداشت کرنا وہ حماقت سمجھنے لگی ہیں۔ مردوں کے لیے جاذب نظر بننے کے لیے وہ لاغر اندام، نرم و نازک، حسین اور جوان بننا چاہتی ہیں۔ ان اغراض کے لیے وہ زہریلی دوائیں تک کھا کر جان

دے سکتی ہیں مگر بچے جن کر صحت خراب کرنا پسند نہیں کرتیں۔ کروڑہا روپیہ اپنے بناؤ سنگھار اور اپنے لباس پر خرچ کر سکتی ہیں، مگر بچوں کی پرورش کے لیے ان کے بجٹ میں گنجایش نہیں نکلتی۔

تہذیب و تمدن نے انتہا درجہ کی نفس پرستی پیدا کر دی ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کریں مگر اس لذت کے ساتھ جو نتائج اور ذمہ داریاں فطرت نے مقرر کی ہیں ان سے بچے رہیں۔ زمانہ حمل اور اس کے بعد بچوں کی پرورش سے اپنے عیش کو کرکرا کرنا انہیں ناگوار ہوتا ہے۔

بچوں کی تعلیم و تربیت اور آیندہ زندگی میں ان کے لیے کامیابی کے مواقع پیدا کرنے کی خاطر بہت سے لوگ (خصوصاً متوسط طبقے والے) ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک دو بچوں سے زیادہ پیدا نہ کریں۔ ان کے معیار اور تخیلات اتنے بلند ہو گئے ہیں کہ ان کے وسائل معاش ان تخیلات کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور ایسے بلند تخیلات کے مطابق زیادہ بچوں کو پرورش کرنا، تعلیم دلوانا، اور زندگی میں ایک اچھے آغاز Start کے مواقع بہم پہنچانا ان کے لیے محال ہے۔ اس کے ساتھ تمدن نے ذرائع تعلیم و تربیت کو نہایت گراں قیمت بھی کر دیا ہے۔

دہریت نے لوگوں کے دلوں سے خدا کا خیال ہی مٹا دیا ہے، کجا کہ وہ اس پر بھروسہ کریں، اور اس کی رزّاقی پر اعتماد رکھیں۔ وہ صرف اپنے موجودہ ذرائع ہی پر نظر رکھتے ہیں، اور خود اپنے آپ کو اپنا اور اپنی اولاد کا رازق سمجھتے ہیں۔

یہ اسباب ہیں جن سے مغربی ممالک میں ضبط ولادت کی تحریک کو اس قدر تیزی اور وسعت کے ساتھ فروغ حاصل ہوا۔ اگر آپ ان اسباب پر غور کی نظر ڈالیں گے تو معلوم ہو گا کہ اہل مغرب نے پہلے خود

ؔ ابھی حال میں نیویارک کے ہیلتھ کمشنر نے ایک تنبیہ شائع کی تھی کہ عورتیں لاغر اندام بننے کے لیے ایک دوا کثرت سے استعمال کر رہی ہیں جس کا نام Dinitrophenol ہے۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ دوا سخت زہریلی ہے اور اب تک بہت سی عورتیں اس کی سمیت سے مر چکی ہیں۔

ہی ایک غلطی کی کہ اپنے تمدن، معاشرت اور معیشت کو سرمایہ داری، مادیت، اور نفس پرستی کی غلط بنیادوں پر تعمیر کیا، اور جب یہ تعمیر اپنے کمال کو پہنچ کر اپنے بڑے نتائج ظاہر کرنے لگی تو پھر انہوں نے دوسری حماقت یہ کی کہ اس ظاہر فریب نظام معیشت و معاشرت، اور طرز تہذیب و تمدن کو علی حالہٖ برقرار رکھ کر اس کے برے ثمرات سے بچنے کی کوشش کی۔ اگر وہ عقلمند ہوتے تو ان اصلی خرابیوں کو تلاش کرتے جن کی بدولت زندگی میں ان کے لیے یہ دشواریاں پیدا ہوتی ہیں، اور ان کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے لیکن انہوں نے اصلی خرابیوں کو سمجھا ہی نہیں، اور اگر سمجھا بھی تو یہ ظاہر فریب تہذیب و معاشرت ان کے لیے اس قدر خوشنما ہو چکی تھی کہ انہوں نے اس کو کسی صالح تر نظام حیات سے بدلنا پسند نہ کیا۔ برعکس اس کے انہوں نے چاہا کہ اس تہذیب و تمدن، اور اس نظام معیشت و معاشرت کو قائم رکھ کر اپنی زندگی کی دشواریوں کو دوسرے طریقوں سے حل کریں۔ اس تلاش و تجسس میں ان کو سب سے زیادہ آسان طریقہ یہی نظر آیا کہ اپنی نسلوں کو بڑھنے سے روک دیں تاکہ ان کو اپنے وسائل معاش اور اسباب عیش سے بلا شرکت غیرے لطف اٹھانے کا موقع مل جائے، اور آیندہ نسلیں ان کے ساتھ حصہ بٹانے اور ان کی زندگی کو غیر مفید اور بے لطف ذمہ داریوں سے گرانبار کرنے کے لیے پیدا ہی نہ ہوں۔

نتائج اب ایک نظر اس تحریک کے ان نتائج پر بھی ڈال لیجیے جو گذشتہ ۶۰ سال کے عملی تجربہ سے ظاہر ہوئے ہیں۔ ۶۰ سال کی مدت ایک ایسی تحریک کے حسن و قبح کا اندازہ کرنے کے لیے بالکل کافی ہے، جس کو مختلف ملکوں اور قوموں میں اس قدر کثرت کے ساتھ اشاعت نصیب ہوئی ہو، اور جس کے نتائج کی بار بار تحقیق کی جا چکی ہو۔

طبقات کا عدم توازن برتھ کنٹرول کرنے والے ممالک میں سے انگلستان کو ایک نمونے کے ملک کی حیثیت سے لیجیے کیونکہ ہمارے پاس دوسرے ممالک کی بہ نسبت اس کے متعلق زیادہ ذرائع معلومات ہیں، اور حالات کے اعتبار سے انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ انگلستان کے رجسٹرار جنرل کی

رپورٹوں اور نیشنل برتھ ریٹ کمیشن کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ برتھ کنٹرول کا رواج سب سے زیادہ اعلیٰ اور اوسط طبقہ میں ہے۔ زیادہ تر اچھی تنخواہیں پانے والے کارکن، اعلیٰ تعلیم یافتہ کاروباری لوگ، متوسط طبقہ کے ذی حیثیت لوگ، اور دولت مند امرا، تجار اور کارخانہ دار اس تحریک پر عامل ہیں۔ رہے ادنیٰ طبقوں کے مزدور اور کام پیشہ، تو ان میں برتھ کنٹرول کا رواج بمنزلہ صفر ہے۔ نہ ان کے معیار زندگی زیادہ بلند ہوئے ہیں، نہ ان کے دلوں میں اونچے حوصلے ہیں، نہ ان میں دولت مندوں کی شان دار معاشرت اختیار کرنے کی ہوس ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ ان کے ہاں ابھی تک وہی قدیم دستور جاری ہے کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے۔ یہی وجہ ہے کہ معاش کی قلت، وسائل زندگی کی گرانی، اور مکانات کی تنگی کے باوجود وہ ضبط ولادت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ان میں شرح پیدائش چالیس فی ہزار کے قریب ہے اور اس کے برعکس اعلیٰ اور اوسط طبقوں میں شرح پیدائش اتنی کم ہوگئی ہے کہ انگلستان کی مجموعی شرح پیدائش صرف ۱۶ فی ہزار رہ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگریزی سوسائٹی میں ادنیٰ طبقے بڑھ رہے ہیں، اور ان گروں کی تعداد روز بروز گھٹتی چلی جا رہی ہے جو عقلی و ذہنی مرتبے کے لحاظ سے بلند درجہ رکھتے ہیں اور جن میں ملکی رہنمائی و رہنمائی کی صلاحیت ہے۔ یہ چیز آخر کار انگریزی قوم کے زوال کی موجب ہوگی۔ اس لیے کہ اس کا لازمی نتیجہ قحط الرجال ہے، اور قحط الرجال کے بعد کوئی قوم دنیا میں سربلند نہیں رہ سکتی۔

زنا اور امراض خبیثہ کی کثرت ضبط ولادت سے زنا اور امراض خبیثہ کو بڑا فروغ نصیب ہوا ہے۔ عورتوں کو دو چیزیں اخلاق کے بلند معیار پر قائم رکھتی ہیں۔ ایک ان کی فطری حیا۔ دوسرے یہ خوف کہ حرامی بچہ کی پیدائش ان کو سوسائٹی میں ذلیل کر دے گی۔ ان میں سے پہلی روک کو تو جدید تہذیب نے بڑی حد تک دور کر دیا۔ رقص و سرود، سینما، نائٹ کلبس، اور شراب نوشی کی محفلوں میں مردوں کے ساتھ آزادانہ شرکت کے بعد حیا کہاں باقی رہ سکتی ہے۔ رہا حرامی اولاد کی پیدائش کا خوف، تو ضبط ولادت کے رواج عام نے اس کو بھی باقی نہ رکھا۔ اب عورتوں اور مردوں کو زنا کا عام لائسنس مل گیا ہے۔ اور زنا کی کثرت کے ساتھ امراض خبیثہ کا بھی ما ضرور بڑھتے

طلاق کی کثرت ضبط ولادت بھی ان اسباب میں سے ہے جنھوں نے مغربی ممالک میں ازدواجی تعلقات کی بندشوں کو کمزور کر دیا ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان زوجی تعلق کو مضبوط کرنے میں اولاد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جب اولاد نہ ہوگی تو زوجین کے لیے ایک دوسرے کو چھوڑ دینا بہت آسان ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں طلاق کا رواج نہایت کثرت کے ساتھ پھیل رہا ہے، اور طلاق حاصل کرنے والوں میں بڑی اکثریت ان جوڑوں کی پائی جاتی ہے جو بے اولاد ہیں۔ حال کا واقعہ ہے کہ لندن کی عدالت طلاق میں ڈیڑھ گھنٹے کے اندر ۱۱۵ نکاح فسخ کرائے گئے اور بلا استثنا رہ سب کے سب ایسے جوڑے تھے جن کے ہاں اولاد نہ ہوئی تھی۔

شرح پیدائش کی کمی سب سے زیادہ اہم نتیجہ یہ ہے کہ جتنی قومیں اس وقت ضبط ولادت پر عمل کر رہی ہیں ان سب کی شرح پیدائش خوفناک حد تک کم ہوگئی ہے۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس تحریک کی اشاعت ۱۸۷۶ء سے شروع ہوئی ہے۔ ذیل کے نقشے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت مختلف ممالک کی فی ہزار شرح پیدائش کیا تھی اور اس کے بعد سے کس طرح گھٹتی چلی گئی:-

	انگلستان اور ویلز	بلجیم	ڈنمارک	فرانس	جرمنی	اٹلی	ہالینڈ	ناروے	سویڈن	سوئٹزرلینڈ
سنہ ۱۸۷۶	۳۶٫۳	۳۳٫۲	۳۲٫۶	۲۶٫۲	۴۰٫۹	۳۹٫۲	۳۷٫۱	۳۱٫۸	۳۰٫۸	۳۳٫۰
سنہ ۱۹۰۱	۲۸٫۵	۲۹٫۴	۲۹٫۷	۲۲٫۰	۳۵٫۷	۳۲٫۶	۳۲٫۳	۲۹٫۶	۲۷٫۰	۲۹٫۰
سنہ ۱۹۱۳	۲۴٫۱	۲۲٫۶	۲۵٫۶	۱۹٫۰	۲۷٫۵	۳۱٫۷	۲۸٫۳	۲۵٫۲	۲۳٫۱	۲۳٫۱
سنہ ۱۹۲۶	۱۷٫۸	۱۸٫۹	۲۱٫۰	۱۸٫۸	۲۰٫۷	۲۷٫۸	۲۳٫۸	۱۹٫۷	۱۶٫۹	۱۸٫۲

یہ نقشہ ضبط ولادت کے نتائج صاف ظاہر کر رہا ہے! اس تحریک کے آغاز کی تاریخ سے تمام ممالک میں بلا استثنا رشرح پیدائش کا کم ہونا اور برابر کم ہوتا چلا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اگر ضبط ولادت اس کی تنہا وجہ نہیں تو ایک بہت بڑی وجہ ضرور ہے۔ خود انگلستان کے رجسٹرار جنرل نے تسلیم کیا ہے کہ شرح پیدائش

کے کم ہونے کی ۹۰ فی صدی ذمہ داری برتھ کنٹرول کے رواج پر ہے۔ انسائکلوپیڈیا برٹانیکا میں بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ مغربی ممالک کی شرح پیدائش کو گھٹانے میں ضبط ولادت کے مصنوعی ذرائع کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔

اس سے زیادہ واضح طور پر ضبط ولادت کے نتائج معلوم کرنے کے لیے ان ممالک کی شرح مناکحت اور شرح پیدائش کا مقابلہ کیجیے۔ انگلستان میں ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۱ء تک شرح مناکحت میں ۳ر۶ فی صدی کی کمی واقع ہوئی لیکن شرح پیدائش ۲۱،۵ فی صدی کم ہوگئی۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۳ء تک شرح مناکحت بدستور قائم رہی مگر شرح پیدائش میں ۱۶ر۵ فی صدی کمی واقع ہوئی۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۶ء تک شرح مناکحت ۱۰ فی صدی اور شرح پیدائش ۲۵ فی صدی کم ہوئی۔ یہی حال تمام یورپ کا رہا ہے۔ ۱۸۷۶ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیان مختلف ممالک میں شرح مناکحت اور شرح پیدائش کا جو تناسب پایا گیا ہے، اس کا حال ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا۔

	شرح مناکحت فی صدی		شرح پیدائش فی صدی	
فرانس	۷،۶	اضافہ	۲۸،۲	کمی
جرمنی	۹،۴	کمی	۴۹،۴	〃
اٹلی	۹،۸	〃	۲۹،۱	〃
ہالینڈ	۱۰،۳	〃	۳۵،۶	〃
سویڈن	۱۱،۳	〃	۴۵،۱	〃
ڈن مارک	۱۲،۳	〃	۳۵،۶	〃
سوئٹزرلینڈ	۱۲،۹	〃	۴۴،۸	〃
انگلستان اور ویلز	۱۳،۳	〃	۵۱،۰	〃
ناروے	۲۶،۰	〃	۳۸،۰	〃

اسی روش پر امریکہ بھی جا رہا ہے۔ وہاں ۵۰ سال کے اندر شرح پیدائش ۳۰ فی ہزار سے گھٹ کر ۲۱ فی ہزار رہ گئی اور سنہ ۱۹۱۶ سے سنہ ۱۹۲۶ تک شرح مناکحت میں ۱۱ فی صدی کی کمی واقع ہوئی، مگر شرح پیدائش اس مدت میں ۱۷ فی صدی کم ہوئی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ضبط ولادت پر عمل کرنے والے ممالک میں عورت اور مرد کے زوجی تعلقات روز بروز کس قدر بے نتیجہ ہوتے جا رہے ہیں شادیوں میں جتنی کمی ہو رہی ہے اس سے زیادہ کمی پیدائش میں ہو رہی ہے۔

شرح پیدائش کی اس روز افزوں کمی کے باوجود ان ممالک کی آبادی میں جو تھوڑا بہت اضافہ ہو رہا ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فن طب کی ترقی اور حفظان صحت کی وسیع تدابیر نے شرح اموات کو بھی بڑی حد تک گھٹا دیا ہے لیکن اب شرح اموات اور شرح پیدائش میں تھوڑا ہی سا فرق رہ گیا ہے، اور عام طور پر خوف کیا جا رہا ہے کہ عنقریب شرح پیدائش، شرح اموات سے کم ہو جائیگی جس کے معنی یہ ہیں کہ ان قوموں میں جتنے آدمی پیدا ہوں گے ان سے زیادہ مر جائیں گے۔ انگلستان میں سنہ ۱۹۳۳ کے ربع اول میں پیدائش کی تعداد ۱۴۸۶۷۵ تھی اور اموات کی تعداد ۱۷۰۰۰۲۔ گویا تین مہینے کے اندر آبادی میں ۲۱ ہزار سے زیادہ کی کمی واقع ہوئی سنہ ۱۹۳۲ کے اسی زمانہ کی بہ نسبت پیدائش میں ساڑھے تین ہزار کی کمی ہوئی اور اموات میں ساڑھے ۱۶ ہزار کا اضافہ ہو گیا۔ سنہ ۱۹۳۳ کے ربع دوم میں پیدائش کی تعداد اموات سے زیادہ تھی مگر آبادی کا اضافہ معمول سے کم رہا۔ اٹلی میں سنہ ۱۹۲۴ کی بہ نسبت سنہ ۱۹۳۲ میں ایک لاکھ ۲۲ ہزار بچے کم پیدا ہوئے۔ مگر اس مدت میں اموات کی کمی صرف ۵۵ ہزار تھی۔ سب سے زیادہ خطرناک حالت فرانس کی ہے جہاں انیسویں صدی کے آغاز سے شرح پیدائش برابر گھٹتی چلی جا رہی ہے؎ سنہ ۱۸۰۰ میں شرح پیدائش ۳۲ء۲ تھی۔ سنہ ۱۹۰۰ میں ۲۲ ہو گئی، اور اب ۱۸ فی ہزار ہے لیکن شرح اموات کی تقلیل شرح پیدائش کی تقلیل کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ میں فرانس کے ۹۰ اقطاع (Departments) میں سے بارہ ایسے تھے جن میں شرح پیدائش شرح اموات سے زیادہ تھی۔ سنہ ۱۹۳۳ میں صرف چھ اقطاع ایسے رہ گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ

؎ فرانس میں ضبط ولادت کا رواج انیسویں صدی کے آغاز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ وہاں فرانسس پلاس اس رواج کا بانی ہے جیسا کہ ابتدائی مضمون میں بیان کیا جاچکا ہے۔

ملک کے ۷ حصے آبادی میں تھوڑا سا اضافہ کر رہے ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں ۴۲ حصے ایسے ہیں جہاں پیدائش کی بہ نسبت اموات کی تعداد زیادہ ہے۔

توفیر آبادی کی کوششیں | ان حالات نے تمام یورپ کے دور اندیش مدبرین میں اضطراب پیدا کر دیا ہے مختصراً ہم بیان کریں گے کہ مختلف ممالک میں شرح پیدائش کی اس کمی کو کس نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔

انگلستان | سنہ ۱۹۱۶ء میں ایک نیشنل برتھ ریٹ کمیشن مقرر کیا گیا جس میں طب، معاشیات، سائنس عددیات (Statistics) تعلیم، اور دینیات کے ۴۳ ماہرین شریک کیے گئے۔ حکومت کی جانب سے ڈاکٹر اسٹیونسن (Stevenson) مہتمم عددیات، اور سر آرتھر نیوزہوم (News-holme) پرنسپل میڈیکل آفیسر اس میں شریک ہوئے۔ اس کمیشن کی طرف سے اب تک متعدد رپورٹیں شایع ہو چکی ہیں۔ ایک رپورٹ میں لکھا گیا ہے کہ۔

برطانیہ کو اپنی شرح پیدائش کی روز افزوں کمی پر نہایت درجہ تشویش کی نظر کرنی چاہیے، اور اس کمی کو روکنے اور حتی الوسع زیادتی کی طرف لے جانے کے لیے ایسی عملی تدابیر اختیار کرنی چاہییں جو اس کے امکان میں ہوں۔"

سر جارج نیومن جو انگلستان کی وزارت صحت کے چیف میڈیکل آفیسر ہیں، شرح پیدائش کی کمی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اگر اس کمی کو نہ روکا گیا تو برطانیہ ایک چوتھے درجہ کی طاقت ہو جائیگی۔"

سر ولیم بیورج (Beveridge) لندن اسکول آف اکنامکس کے ڈائرکٹر نے حال میں اپنی ایک نشر صوتی تقریر میں کہا کہ اموات اور پیدائش کا تناسب اگر اسی رفتار سے بگڑتا رہا تو آئندہ دس سال میں انگلستان کی آبادی گھٹنی شروع ہو جائے گی اور ۳۰ سال کے اندر ۲۰ لاکھ کی کمی واقع ہو گی۔ قریب قریب یہی رائے لورپول یونیورسٹی کے پروفیسر کار سانڈرس کی ہے۔ اس خطرے کو دور

کرنے کے لیے ضبط ولادت کے خلاف تحریک شروع ہوگئی ہے۔ اور جمیعت حیات قومی (League of National Life) کے نام سے ایک انجمن قائم کی گئی ہے جس میں ممتاز مرد اور خواتین شریک ہیں۔

فرانس حکومت کو اس خطرے کا احساس ہوگیا ہے کہ شرح پیدائش کا زوال فرانسیسی قوم کا زوال ہے۔ فرانس کے اہل بصیرت محسوس کر رہے ہے کہ اگر اسی رفتار سے ان کی آبادی گھٹتی رہی تو ایک روز فرانسیسی قوم صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی۔ مردم شماری کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۱۱ء کے مقابلہ میں سنہ ۱۹۲۱ء میں فرانس کی آبادی ۲۱ لاکھ کم ہوگئی۔ سنہ ۱۹۲۶ میں ۵ الاکھ کا اضافہ ہوا لیکن وہ زیادہ تر غیر ملکی لوگوں کی درآمد کا نتیجہ تھا۔ فرانس میں اجنبی قوموں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے یہاں تک کہ آبادی کا ۲،۷ فی صدی حصہ اجنبی ہے۔ یہ فرانسیسی قوم کے لیے اور بھی زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ قوم پرستی کے موجودہ دور میں اجنبی آبادی کا بڑھنا اور وطنی آبادی کا گھٹنا قومی زندگی کے لیے تباہی کا پیش خیمہ ہے فرانس میں ایک زبردست تحریک (National Alliance for the Increase of Population) کے نام سے اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے شروع ہوگئی ہے حکومت نے ضبط ولادت کی تعلیم اور نشر و اشاعت کو قانوناً ممنوع قرار دیا ہے۔ آبادی بڑھانے کے لئے تقریباً ایک درجن قوانین نافذ کیے گئے ہیں جن کی رو سے زیادہ بچے پیدا کرنے والے خاندانوں کو مالی امداد دی جاتی ہے، ٹیکس میں کمی کی جاتی ہے، تنخواہیں مزدوریاں اور پنشنیں زیادہ دی جاتی ہیں۔ ان کے لیے ریل کے کرائے کم کیے جاتے ہیں، حتیٰ کہ انھیں تمغے تک دیے جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف شادی نہ کرنے والوں یا بچے نہ رکھنے والے جوڑوں پر (Surtax) لگایا جاتا ہے۔ گویا بعد از خرابی بسیار اب فرانسیسی قوم کی آنکھ کھلی ہے، اور وہ اس گناہ کا کفارہ ادا کر رہی ہے جو اس نے قوانین فطرت سے انحراف کرکے ضبط ولادت کی صورت میں کیا تھا۔

جرمنی | نازی جماعت نے برسر اقتدار آنے کے بعد آبادی کے بڑھتے ہوئے زوال کو سب سے بڑا خطرہ قرار دیا اور اس کے تدارک کی کوشش کی۔ ایک نازی اخبار نے لکھا کہ:۔

"اگر ہماری شرح پیدائش اسی طرح گھٹتی رہی تو خوف ہے کہ ایک وقت ہماری قوم بالکل بانجھ ہو جائے گی۔ اور موجودہ نسل کے کاموں کو سنبھالنے کیلئے نئی نسلیں اٹھنی بند ہو جائینگی"

اس حالت کی اصلاح کے لیے حکومت نے ضبط ولادت کی تعلیم و ترویج کو قانوناً روک دیا۔ عورتوں کو کارخانوں اور دفتروں سے خارج کرنا شروع کیا۔ نوجوانوں کو نکاح کی طرف رغبت دلانے کے لیے قرضہ شادی (Marriage loan) کے نام سے رقمیں دیں، بن بیاہوں اور بے اولادوں پر ٹیکس لگائے۔ اور زیادہ بچے پیدا کرنے والوں پر ٹیکس کم کر دیے ۱۹۳۴ء میں ایک کروڑ پونڈ کے قرضہ ہائے شادی دیے گئے جن سے ۲ لاکھ مردوں اور عورتوں نے فائدہ اٹھایا ۱۹۳۵ء کے نئے قانون کی رو سے ایک بچہ پیدا ہونے پر انکم ٹکس میں ۱۵ فی صدی، دو بچوں پر ۳۵ فی صدی، تین پر ۵۵ فی صدی، چار پر ۷۵ فی صدی، پانچ پر ۹۵ فی صدی کمی کی جاتی ہے، اور جب چھ بچے ہوتے ہیں تو پورا انکم ٹکس معاف کر دیا جاتا ہے۔

اٹلی | مسولینی کی حکومت ۱۹۳۲ء سے آبادی بڑھانے کی طرف خاص توجہ کر رہی ہے۔ ضبط ولادت کی نشر و اشاعت قانوناً ممنوع ہے۔ نکاح اور تناسل کی ترغیب کے لیے وہ تمام تدابیر اختیار کی جارہی ہیں جو جرمنی اور فرانس کے حالات میں بیان کی گئی ہیں۔

سویڈن | حال میں سویڈن کے ایک سابق وزیر (Trygger) نے پارلیمنٹ (Riksdag) میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر سویڈش قوم خودکشی نہیں کرنا چاہتی ہے تو شرح پیدائش کی روز افزوں کمی کو روکنے کے لیے فوری تدابیر کرنے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۲۱ء سے شرح پیدائش کی کمی خوفناک ہو گئی ہے اور آبادی میں اضافہ بند ہو گیا ہے"۔ اس تنبیہ کا یہ اثر ہوا کہ اب سویڈش پارلیمنٹ

ایک کمیشن مقرر کرنے والی ہے جو آبادی کی توفیر کے ذرائع دریافت کریگا۔

اب آپ برتھ کنٹرول سے کافی روشناس ہو چکے ہیں۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ اس تحریک کی حقیقت کیا ہے، کن وجوہ سے یہ پیدا ہوئی، کن اسباب سے اس نے ترقی کی، جن ممالک میں یہ رائج ہو چکی وہاں اس کے کیا نتائج رونما ہوے، اور جنہوں نے اس کا اچھی طرح تجربہ کرلیا ہے وہ اب اس کو کس نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد ہمیں امید ہے کہ برتھ کنٹرول کے متعلق اسلام کا فتوی زیادہ آسانی کے ساتھ آپ کی سمجھ میں آئے گا، زیادہ گہرائی کے ساتھ ذہن نشین ہوگا۔ اور اس کی مصلحتیں زیادہ روشنی کے ساتھ آپ پر واضح ہوں گی۔ باقی

الجهاد فی الاسلام

تالیف ابوالاعلی مودودی

مسئلہ جہاد پر ایک جامع کتاب جس میں جہاد کی حقیقت، اس کے اغراض و مقاصد، اور اس کے قوانین پر مفصل بحث کی گئی ہے، اور آخر میں دنیا کے چار بڑے مذاہب (ہندو مذہب، بودھ مذہب، یہودیت، اور مسیحیت) کی تعلیمات اور دور جدید کے مغربی قوانین سے اسلام کی تعلیم جنگ اور جنگی قوانین کا تفصیلی مقابلہ کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے جنگ کو ایک وحشیانہ فعل کے بجائے ایک مقدس اخلاقی فعل بنا دیا۔ ضخامت ۵ سو صفحات قیمت للعہ انگریزی، للعہ سکۂ عثمانیہ۔ مجلد کی قیمت صمہ انگریزی صمہ سکۂ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن۔ خیریت آباد حیدرآباد دکن

تنزیل و تاویل

برزخ کا ایک گوشہ

از جناب مولانا سید سلیمان ندوی

جناب مدیر ترجمان القرآن! ایدك الله بنور منه۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
آپ کے رسالہ کی اشاعت ذی قعدہ ۵۳ھ میں تعلیمات۔ قرآن کے مصنف شہیر کا ایک دلچسپ مضمون عالم برزخ پر چھپا ہے جس میں بظاہر معارف کے اعتراضات و دلائل کا جواب دیا گیا ہے لیکن اگر دعووں کا دوبارہ دہرا دینا ہی جواب ہے تو مجھے تسلیم ہے کہ یہ مضمون اپنے مقصد میں کامیاب ہے مصنف شہیر نے اپنی کتاب اور اپنے مضمون کے بعینہ صفحات والفاظ کسی قدر تغیر کے ساتھ اس مضمون میں نقل کر دیے ہیں، جہاں تک ان گذشتہ دعووں کے اعادہ کا تعلق ہے مجھے معارف کے مضامین کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، البتہ اس مضمون میں دو نئی باتیں ہیں جن کا جواب اخلاقاً مجھ پر فرض ہے
آیت عرض نار| میں نے عذاب برزخ کے ثبوت میں دوسری آیتوں کے ضمن میں یہ آیت پیش کی تھی۔

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۔ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (مومن۔ ۵)	اور آل فرعون کو برے عذاب نے آگھیرا آگ اس پر وہ صبح و شام پیش کئے جاتے ہیں اور جس دن قیامت کی گھڑی کھڑی ہوگی (حکم ہوگا) آل فرعون کو (اس سے زیادہ) سخت عذاب میں داخل کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کی گھڑی سے پہلے بھی کفار کو صبح و شام کوئی سزا مل رہی ہے جیسا

زیادہ سخت سزا قیامت کے دن دے جانے کا حکم ہوگا۔

اس آیت پاک کا جو ترجمہ کرکے میں نے استدلال کیا ہے قرآن پاک کا ہر ترجمہ کرنے والا اس کی صحت کا غالباً معترف ہوگا۔ تاہم مصنف مذکور نے فرمایا :۔

"وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ میں واو کا ترجمہ "اور" غلط ہے، بلکہ واو کا ترجمہ "یعنی" کرنا چاہیے یعنی اس طرح "" آگ جس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جائیں گے یعنی قیامت کے دن حکم دیا جائے گا کہ آل فرعون کو سخت ترین سزا میں داخل کرو" (جامعہ)

میں نے جواب میں لکھا :۔

واؤ کا اس طرح "یعنی" ترجمہ ہونا میں تحدی کرتا ہوں کہ نحو کے کسی قاعدہ سے ثابت کیا جائے ۔ (معارف ۳۴ ۔ ص ۴)

اس تحدی کے جواب میں جناب مصنف نے یہ کیا کہ اپنی کتاب میں صفحہ بدل کر اپنا ترجمہ میرے ترجمہ کے مطابق درست کرلیا چنانچہ ترجمان القرآن کے اس مضمون میں بھی اس ترجمہ کو میرے ہی ترجمہ کے مطابق انہوں نے پیش کیا ہے۔ اب زور "یعنی" پر نہیں بلکہ اس پر ہے کہ "يُعْرَضُوْنَ" کا ترجمہ حال کے بجائے مستقبل کیا جائے یعنی "پیش کیے جاتے ہیں" کے بجائے "پیش کیے جائیں گے" اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قیامت کے دن ہوگا۔ لیکن اس تقدیر پر حسب ذیل اعتراضات لازم آتے ہیں :۔

ا۔ آیت کے دو ٹکڑے ہیں۔

ا۔ وہ آگ پر پیش کیے جائیں گے صبح اور شام۔

ب۔ اور جس دن قیامت کھڑی ہوگی حکم ہوگا کہ ان کو سخت تر عذاب میں داخل کرو

اب سوال یہ ہے کہ جب قیامت کے دن ان کو سخت تر عذاب میں داخل کیے جانے کا حکم ہوگا، تو اس سے پہلے جس آگ پر وہ صبح اور شام پیش کیے جائیں گے وہ کونسا عذاب ہے؟ کہ وہ (باقی ہے)

قیامت کا نہیں کیونکہ ابھی اُس کے عذاب کا حکم ہوا نہیں بلکہ قیامت کے پہلے کا عذاب ہوگا، اور قیامت کے پہلے اور قوم فرعون کی ہلاکت کے بعد جو مدت ہے وہی برزخ ہے۔

۲۔ اگر پہلا ٹکڑا یعنی صبح و شام کا عذاب اور دوسرا ٹکڑا یعنی قیامت میں ان پر سخت تر عذاب ہونے کا حکم، دونوں قیامت ہی سے متعلق ہوتے تو آیت کے ان دونوں ٹکڑوں کی ترتیب الٹی ہوتی یعنی یوں۔

"جس دن قیامت کھڑی ہوگی (حکم ہوگا) کہ ان کو سخت تر عذاب میں داخل کرو، (چنانچہ اس کی تعمیل یوں ہوگی، کہ وہ آگ پر صبح و شام پیش کیے جائنگے"

مگر ظاہر ہے کہ اللہ تعالی نے یوں نہیں فرمایا۔

۳۔ اگر پہلا ٹکڑا صبح و شام میں آگ پر پیش کیے جانا قیامت سے متعلق ہو تو لازم آئیگا کہ قیامت میں دوزخ کا عذاب کافروں کو مسلسل نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً ہوگا یعنی صبح و شام۔ اور یہ تصریحات قرآنی کے خلاف ہے، اس کی نسبت تو بار بار تصریح ہے کہ لَا یُفَتَّرُ اور لَا یُخَفَّفُ ایک سکنڈ کے لیے بھی موقوف نہ ہوگا، اور کم نہ کیا جائے گا۔

اس اعتراض کے دفع دخل کے لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ صبح و شام سے مراد دوام ہے جس طرح جنت کے لیے قرآن نے کہا ہے۔

وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا۔ اور ان (جنتیوں) کے لیے اس میں ان کی روزی ہے صبح اور شام۔ (۱۹: ۶۲)

کیونکہ یہ آیت اہل جنت کے کھانے کے متعلق ہے، کہ جنت میں ان کو صبح و شام کھانا ملتا رہیگا چونکہ انسان عموماً اور اہل عرب خصوصاً صبح کو اور شام کو کھانا کھاتے ہیں اس لیے اس عرف عام اور محاورۂ عام کی بنا پر جنت کے متعلق یہ کہا گیا ہے۔ ورنہ قرآن کی تصریح ہے کہ ہر وقت اہل جنت

جو چاہیں گے کھائیں گے۔ اس دوام کا یہ مفہوم نہیں کہ اہل جنت کا منہ حکماً ہر وقت چلتا رہے گا اور ایک سکنڈ میں ان کا کھانا موقوف نہ ہوگا، اگر یہ دوام ہو تو پھر تو جنت بھی دوزخ ہو جائے۔

لیکن جو دوام اہل دوزخ کے لیے ہے وہ یہ نہیں ہے کہ عذاب اپنی جگہ پر ہمیشہ تیار رہیگا اور جب ان کا جی چاہے گا دو چار وقت دوزخ کی بھی سیر کر آئیں گے جس طرح اہل بہشت کے لیے دوزخ کا دوام ہے کہ کھانے اور پھل اپنی جگہ ہمیشہ تیار رہیں گے، اہل بہشت کا جی جب چاہے گا کھا لیں گے۔

۴۔ آیت زیر بحث میں ایک جگہ عذاب، اور دوسری جگہ اشدالعذاب ہے اَشَدّ اسم تفضیل ہے وہ مفضل منہ کو چاہتا ہے یعنی کسی سے بڑھ کر۔ اب اگر پہلا ٹکڑہ بھی قیامت کے عذاب سے متعلق ہو جیسا کہ مدعی چاہتے ہیں تو دوزخ سے بڑھکر اشد عذاب اور کہاں ہوگا؟ اس سے معلوم ہوا کہ پہلا ٹکڑا عذاب برزخ سے متعلق ہے جہاں صرف صبح و شام کا سوءالعذاب ہے۔ اور دوسرا قیامت کے دن ہوگا۔ جہاں اس پہلے عذاب سے بڑھکر ہمہ وقت کا سخت عذاب ہوگا۔ اور اس طرح یہ آیت بایک ہر طرح سے بامعنی ہوگی۔؟

ان وجوہ سے آیت بالا کا صحیح ترجمہ یہی ہے:۔

"اور آل فرعون کو بُرے عذاب نے آ گھیرا۔ آگ۔ وہ صبح و شام اس پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اور جس دن قیامت کی گھڑی کھڑی ہوگی حکم ہوگا کہ آل فرعون کو اس سے زیادہ سخت عذاب میں داخل کر دو"

اس آیت میں بکمال تصریح دو عذابوں کا ذکر ہے، ایک قیامت سے پہلے جس میں وہ بالفعل مبتلا ہیں اور جو صرف صبح و شام ہے۔ اور اس میں دوزخ پر پیش ہونا ہے اور جو صرف سوء عذاب ہے۔ دوسرا وہ جس کا حکم قیامت کے دن ہوگا اور جو ہمہ وقت ہوگا۔ اور جو اشدالعذاب، اور اس

پہلے عذاب سے بڑھکر ہوگا۔

فرد اً اور فرادیٰ دوسری آیت معارف نے عذاب برزخ کے ثبوت میں یہ پیش کی تھی۔

وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا (٦: ١١)

اور اگر تو دیکھے جب گنہگار موت کی سختیوں میں ہوتے ہیں اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوتے ہیں نکالو اپنی جانیں، آج تم ذلت کا عذاب دئے جاؤگے اس لیے کہ تم اللہ پر وہ بات کہتے تھے جو سچ نہ تھی، اور تم اللہ کی آیتوں سے غرور کرتے تھے، اور بے شک تم ہمارے پاس ایک ایک کرکے آئے جیسا ہم نے تمکو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا اور ہم نے جو تمکو دولت دے رکھی تھی اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے اور تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو ہم نہیں دیکھتے جن کو تم اپنے میں شریک سمجھتے تھے۔

اس آیت کے تین مواقع سے معارف نے استدلال کیا تھا۔

۱۔ اس میں تصریح ہے کہ موت کے وقت ہی سے عذاب کا منظر کچھ سامنے آجاتا ہے۔

۲۔ اس میں تصریح ہے کہ آج کے دن یعنی جس وقت موت واقع ہو رہی ہے رسوائی کا عذاب شروع ہوگیا۔ اور یہی برزخ کا عذاب ہے۔

۳۔ اس میں فرادیٰ کا لفظ ہے یعنی ایک ایک کرکے تم آئے، یہ ایک ایک کرکے آنا موت کا ساتھ ہے نہ کہ قیامت کا، کیونکہ قیامت میں ایک کرکے (یا ایک کے بعد ایک) نہیں آئیں گے، بلکہ فوج در فوج آئینگے جیسا کہ قرآن میں احوال قیامت کے سلسلہ میں بار بار مصرح ہے۔

مصنف ان آیتوں کو قیامت کے دن کا واقعہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان میں قیامت کا ذکر تک

نہیں اور معارف کے مواقع استدلال کا وہ یہ جواب دیتے ہیں۔ کہ چونکہ موت اور قیامت میں مسافت زمانی نہیں (کما زعم) اس لیے الیوم سے مراد قیامت کا دن ہے۔ ہمارا جواب یہ تھا کہ الیوم ظرف ہے اس سے وُہی دن مراد ہوگا جس کے فعل کے سلسلہ میں وہ واقع ہے، اس لیے اُس سے وہ زمانہ مراد ہے جو موت کے وقت سے شروع ہو گیا۔ ان دو بیانوں میں سے ایک کے صحیح ہونے کا فیصلہ خود ناظرین آیت بالا کے ترجمہ کو خالی الذہن ہو کر پڑھ کر کر سکتے ہیں۔

فُرادیٰ (ایک ایک کرکے) کے لفظ سے جو ہمارا استدلال تھا کہ ایک ایک کرکے آنا موت کے بعد کا نقشہ ہے نہ کہ قیامت کا اس کے رد میں مصنف مدعی نے قرآن پاک کی دو آیتیں نقل کی ہیں:-

پہلی آیت (حسب نقل مدعی)۔

وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا وَعُرِضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (۴۸)

اور ہم ان کو حشر میں اٹھائیں گے اور ان میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے اور وہ صف بستہ تیرے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے، اور (ان سے کہا جائیگا) کہ تم ہمارے پاس اکیلے آئے جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔

اس آیت سے حشر کے دن ایک ایک کرکے آنا تو ثابت ہو گیا لیکن صرف اُہل علم ہی کی دلچسپی کے لیے یہ کہتا ہوں کہ اس آیت کا حوالہ سورۂ کہف کی اڑتالیسویں آیت کا دیا گیا ہے ہر خواندہ مسلمان سورۂ کہف کی آیت ۴۸ (رکوع ۶) خود اپنی آنکھ سے دیکھے کہ اس میں فرادیٰ کا لفظ سرے سے ہے ہی نہیں۔ بلکہ آیت مذکور یوں ہے:-

لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (۴۸) بیشک تم ہمارے پاس آئے جیسا ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا

اگر اس آیت میں جو قیامت کے سلسلہ میں ہے خدا کے پاس تنہا اور بے یار و مددگار آنا مذکور ہے تو اس سے یہ استدلال صحیح نہ ہوگا کہ جیسا کہیں خدا کے پاس جانا اور مال و دولت اور اہل و عیال سے چھوٹ جانا۔ قرآن میں مذکور ہوا اس سے قیامت ہی کا احوال مقصود ہے کیونکہ موت کے بعد بھی

خدا کے ہاں جانا اور مال و دولت اور اہل و عیال سے چھوٹ جانا مذکور ہے۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ وَقِیْلَ مَنْ رَاقٍ وَّ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۔ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ (قیامہ) ہرگز نہیں جب جان حلق تک پہنچے اور کہا جائے کہ اب کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا، اور جانے کہ اب ہے سب سے چھوٹنا اور پنڈلی پنڈلی میں لپٹ جائے اس دن تیرے پروردگار کی طرف چلنا۔

یہ کہنا بھی کہ "اول مرۃ" "پہلی دفعہ کی پیدائش" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری دفعہ کی پیدائش یعنی قیامت کے موقع کی آیت ہے، صحیح نہیں، کیونکہ دوسری پیدائش کے وقت کی حالت تو انسان نے دیکھی نہیں اس لیے اس کی پہلی ہی پیدائش کی تنہائی و بیکسی کا حوالہ دیا جانا قرین بلاغت ہے جس کا مشاہدہ ہر انسان کو ہر وقت ہوتا رہتا ہے، خواہ یہ حوالہ موت کے وقت دیا جائے، یا قیامت میں دونوں کی ایک سی صورت ہے۔

آخر میں معارف کے مدیر حقیر کے ایک استدلال کا رد ان لفظوں میں کیا گیا ہے:۔

"مدیر معارف کے استدلال کی بنیاد "فرادیٰ" کے لفظ پر ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ ایک ایک کرکے لوگ برزخ میں جاتے ہیں، اور قیامت کے دن ایک ایک کرکے نہیں جائیں گے، بلکہ جھنڈ کے جھنڈ جائیں گے اس لیے اس لفظ سے ظاہر ہو گیا کہ یہ برزخ کا عذاب ہے۔ غالباً انہوں نے قیامت کے دن کے متعلق یہی دیکھا ہے کہ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا یعنی تم جھنڈ کے جھنڈ آؤ گے، اور اس پر نظر نہیں پڑی کہ

كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا (۹۶/۱۹) ان میں ہر ایک قیامت کے دن اکیلا آئے گا۔"

گذارش ہے کہ مدیر معارف نے قرآن میں قیامت کے دن کے متعلق یہ بھی دیکھا ہے اور اس پر بھی اس کی نظر پڑی ہے، اور دوسری آیتیں بھی پڑھی ہیں اور ساتھ ہی ادب و لغت کا بھی مطالعہ کیا ہے۔

مدیر معارف نے برزخ کے ثبوت میں آیت (پ ۹) کے جس لفظ سے استدلال کیا ہے وہ فرادیٰ ہے فَرۡدًا نہیں۔ قیامت کے سلسلہ میں قرآن میں کہیں فرادیٰ نہیں آیا ہے جس ایک آیت میں قیامت کے تعلق سے انہوں نے فُرادیٰ نقل کیا ہے۔ وہ دانستہ یا نادانستہ تحریف ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ البتہ جیسا کہ اس آیت میں ہے قیامت کے سلسلہ میں فرداً کا لفظ آیا ہے، اور جناب مصنف کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ فرادیٰ چونکہ فرداً کی جمع ہے اس لیے یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں، اس لیئے قیامت کے سلسلہ میں کہیں فَرداً ہونا، گویا فرادیٰ ہونا ہے۔

قدیم مفسرین کے بیانات خواہ وہ ہمارے مخالف ہوں یا ان کے مخالف، طرفین میں سے کسی کے لیے دلیل نہیں، اس لیے ادب و لغت بلکہ خود قرآن پاک کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

فرادیٰ قطعاً جمع ہے مگر کس لفظ کی جمع ہے؟ بعضوں نے کہا کہ فرداً کی جمع ہے، کوئی کہتا ہے فرید کی جمع ہے کسی کا دعویٰ ہے کہ قاعدہ کے مطابق فردان کی جمع۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ فَرۡدًا سے فُرادیٰ پر استدلال قطعی الثبوت نہیں بہرحال اکثروں کے نزدیک فرد کی جمع افراد اور فرادیٰ دونوں ہے، تاہم ان دونوں کے معنی اور استعمال کے مواقع میں عظیم الشان فرق ہے۔ فَرۡد کی دو جمعیں ہیں اَفراد اور فرادیٰ اَفراد باقاعدہ جمع ہے اور فُرادیٰ جمع معدول ہے اور خلاف قیاس ہے جب عربی میں یہ بولا جائیگا کہ فلاں فرداً رہ گیا، یا فرداً ہو کر آئے گا، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ تنہا بے مونس و غمگسار اور بے یار و مددگار رہے یا ہو گیا، اس کے ثبوت میں ایک جاہلی عرب کا شعر اور قرآن پاک کی آیت پیش ہے۔ خالص عرب مخضرم شاعر عمرو بن معدی کرب کہتا ہے (حماسہ باب الحماسہ)۔

کَم مِن اَخٍ لِی صَالِحٍ بَوَّأتُهُ بِیَدَیَّ لَحۡدًا
کتنے میرے اچھے بھائی تھے جن کو میں نے اپنے ہاتھوں سے قبر میں سلایا
ذَهَبَ الَّذِیۡنَ اُحِبُّهُمۡ وَبَقِیۡتُ مِثۡلَ السَّیۡفِ فَرۡدًا
جو میرے پیارے تھے وہ چلے گئے اور میں تلوار کی طرح تن تنہا رہ گیا

یعنی کوئی میرا پیارا نہ رہا،

قرآن میں حضرت زکریا کی دعا میں ہے:-

وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ (انبیاء - ۶)

اور زکریا کو یاد کرو جب اُس نے اپنے پروردگار کو پکارا اے میرے پروردگار مجھے یوں تن تنہا مت چھوڑ اور تو وارثوں میں بہتر ہے۔ تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اس کو یحییٰ بخشا۔

اس آیت میں بھی فَرْدًا چھوڑے جانے سے یہی مقصد ہے، کہ کوئی والی وارث اور اولاد نہو، خدا نے ان کی اس دعا کو قبول فرمایا اور اولاد بخشی۔

اہل عرب کو ہر جاہل اور غیر متمدن قوم کی طرح بیٹوں اور اولاد کی کثرت پر بہت ناز رہتا تھا کہ ان سے کنبے کی جنگی قوت تھی۔ خدا نے فرمایا کہ قیامت کے دن کوئی کسی کا نہو گا۔ نفسی نفسی کا عالم ہوگا، وہاں کوئی باپ بیٹے کا رشتہ نہ ہوگا، خدا کے حضور میں ہر شخص تنہا اور اپنا آپ ذمہ دار ہوگا۔ جس طرح حضرت زکریا نے خاندان، جماعت اور قوم کی جمعیت کے باوجود آل اولاد نہ ہونے کے سبب سے اپنے کو تن تنہا فرمایا کہ ان میں سے کسی کا ان سے محبت کا تعلق نہ تھا۔ اسی طرح قیامت میں سب انسان فوج در فوج اور انبوہ در انبوہ ہونے کے باوجود، بیگانہ افراد ہوں گے، اور ان میں سے ایک کا دوسرے سے کوئی واسطہ نہ ہوگا، کہ

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ (مومنون - ۶)

اور جب صور پھونکا جاوے گا۔ تو ان کے درمیان کوئی نسب و رشتہ نہ ہوگا۔

اب اس تفصیل کے بعد قرآن پاک کا وہ موقع پڑھیے جس میں ہر شخص کے قیامت کے دن تن تنہا اور فرد ہو کر آنے کا ذکر ہے۔ پہلے کفار کے اس دعوے کا کہ ہم صاحب مال اور صاحب اولاد میں اور قیامت میں بھی رہیں گے، ذکر ہے، پھر خدا کی طرف سے ان کا جواب ہے:-

أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا وَنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا	کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے ہماری آیتوں کا انکار کیا اور کہا کہ ہم کو (قیامت میں بھی) مال اور اولاد ملے گی، کیا اس کو غیب کا حال معلوم ہو گیا۔ یا اس نے خدا سے عہد لے لیا ہے، ہرگز نہیں جو کچھ یہ بکتا ہے ہم اس کو لکھ لینگے اور اس کے لیے عذاب کا حصہ بڑھاتے جائیں گے" اور جس

(مال و اولاد) کا یہ نام لیتا ہے اس کے ہم ہی وارث ہوں گے اور وہ ہمارے پاس تن تنہا آئے گا۔

پھر اسی جواب کے آخر میں ہے۔

وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا (مریم-۶)	اور ان میں ہر ایک قیامت کے دن تن تنہا آئے گا۔

یہ ہے اس آیت کا بیان جس میں قیامت کے سلسلے میں ہر شخص کے "تن تنہا" ہو کر آنے کا ذکر ہے لیکن جس آیت سے معارف نے استدلال کیا تھا اس میں فرادیٰ ہے، جو جمع معدول ہے، اس کے معنی ایک ایک کرکے ہیں جیسے مثنیٰ و ثلث و رباع۔ ایک ایک، دو دو، تین تین، چار چار، قرآن پاک نے انہیں معنوں میں لفظ فرادیٰ کو دوسری جگہ استعمال کیا ہے جس سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے، فرمایا۔

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ (سبا-۱۲)	اے پیغمبر کہدے کہ میں تم کو نصیحت کی ایک بات کہتا ہوں کہ تم خدا کے لیے دو دو۔ اور ایک ایک کھڑے ہو جاؤ، پھر سوچو کہ تمہارے رفیق (یعنی پیغمبر) کو کسی طرح کا جنون نہیں،

دیکھ لیجیے! یہاں فرادیٰ کا مقصود مال و دولت آل اولاد اور دوست احباب چھوڑ کر تن تنہا نہیں بلکہ مقصود صرف ایک ایک ہونا ہے، اسی طرح آیت زیر استدلال میں ہے

لَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (۹۴)	بیشک تم ہمارے پاس ایک ایک کرکے (یا ایک کے بعد ایک) اسی طرح آئے جس طرح پہلی دفعہ ہم نے تم کو پیدا کیا۔

یعنی ہر ایک تم میں ایک ایک، ایک کے بعد ایک اور اکیلا اکیلا ہو کر اسی طرح ہمارے پاس آیا جس طرح ہمارے پاس سے وہ ایک ایک، ایک کے بعد ایک اکیلا اکیلا ہو کر گیا تھا اب یہ تصویر موت کے وقت کی ہے نہ کہ قیامت کی، کیونکہ قیامت میں لوگ ایک ایک کر کے ایک کے بعد ایک اکیلے اکیلے نہیں جائیں گے بلکہ فوج در فوج جائیں گے۔ البتہ ان میں سے ہر شخص تن تنہا، اور بے یار و مددگار ہوگا، اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ عربی کے اس محاورہ کے کہ جاؤ افرادیٰ جس کو قرآن نے استعمال کیا ہے کیا معنی ہیں سب سے قدیم لغت نویس ابن درید المتوفی ۳۲۱ھ کہتا ہے:۔

وَجَاءَ القوم فرادیٰ اذ اجاء واد احدًا بعد واحدٍ۔ جمہرہ (۲۔ صـ۲۵۲) جار القوم فرادیٰ۔ جب لوگ ایک کے بعد ایک کر کے آئے۔

عربی کے مستند ترین لغت صحاح جوہری میں ہے۔

وَیُقَالُ جاؤ فرادا وفُرادیٰ ای وَاحِدًا واحِدًا۔ اور کہا جاتا ہے جاؤ فرادًا اور فرادیٰ جب ایک ایک کر کے آئے۔

عربی کے قدیم وسیع ترین لغت لسان العرب لابن منظور افریقی میں ہے۔

وَجَاؤ فُرادیٰ وفِرَادیٰ ای واحِدًا بَعد واحدٍ اور جاؤ افرادیٰ اور فراداکے یہ معنی ہیں کہ ایک کے بعد ایک۔

اردو کے بہترین مترجم نے جو جناب مصنف کے نزدیک بھی بہتر ہے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے۔

"اور تم ہمارے پاس آئے ایک ایک جیسے ہم نے بنائے تھے پہلی بار" (انعام ۔۱۰)

اب غور کے قابل بات ہے کہ ایک ایک کر کے اور ایک کے بعد ایک آنا موت کے بعد عالم برزخ میں ہے، یا قیامت میں؟ ظاہر ہے کہ یہ نقشہ موت کے وقت کا اور عالم برزخ کا ہے، نہ کہ قیامت کا، ساتھ ہی اس آیت کے شروع میں صاف وصریح طور پر "موت" کے وقت کی تصریح ہے اور قیامت کا اشارہ تک نہیں،

ایک دفعہ ناظرین اس زیر بحث آیت پاک کو پھر پڑھ لیں۔

وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ	اور اگر تو دیکھے جب گنہگار موت کی سختیوں میں ہوتے
وَالْمَلٰٓئِکَةُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْهِمْ اَخْرِجُوْٓا	ہیں اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوتے ہیں کہ نکالو اپنی
اَنْفُسَکُمْ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ	جانیں، آج تم ذلت کا عذاب دیے جاؤ گے، کیونکہ اللہ
بِمَا کُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ	وہ بات کہتے تھے جو سچ نہ تھی، اور تم اس کی آیتوں سے
وَکُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَکْبِرُوْنَ ۔ وَلَقَدْ	غرور کرتے تھے، اور بیشک تم ہمارے پاس ایک ایک کرکے
جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ	آگئے جیسا ہم نے تمکو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا، اور ہم نے تمکو جو
مَرَّةٍ وَّتَرَکْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰکُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِکُمْ	دولت دے رکھی تھی، اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے اور ہم
وَمَا نَرٰی مَعَکُمْ شُفَعَآءَکُمْ	تمہارے سفارشیوں کو ساتھ نہیں دیکھتے۔

یہ پورا بیان بغیر تاویل دکج بحثی کے سراسر موت کے وقت اور برزخ سے تعلق رکھتا ہے جس کے لیے ان آیات کا حرف حرف گواہ ہے،

اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی سے جو خدا کا قول ہے قیامت کے واقعہ کا بیان ہے اور فرادیٰ کے معنی منفردین کے ہیں۔ تاہم اوپر کی آیت وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ سے برزخ کے عذاب کا جو قطعی ثبوت ملتا ہے اس کا انکار اَلْیَوْمَ کی نامربوط تاویل سے نہیں ہوسکتا، یہ فرشتوں کا قول ہے گنہگار برزخی انسان کا نہیں جن کو زمانہ کا پورا پورا احساس نہ ہوگا۔ (والسلام)

سید سلیمان ندوی

۵ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ

رسائل و مسائل

تعلیمات قرآن کے متعلق بحث

(۴)

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی اے

ملکیت زمین اس میں تو شک نہیں کہ صاحب تعلیمات نے جس آیت سے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے وہ اساسی قانون کی بظاہر حامل نظر نہیں آتی لیکن اس کے خلاف ملکیت زمین کی تائید میں بھی تو کوئی آیت آپ نے نقل نہیں فرمائی اب اس بارہ میں رسول اللہ کا اسوہ حسنہ ہی قول فیصل ہوگا۔ میری محدود نظر نے جہاں تک کام کیا ہے، میں تو دیکھتا ہوں کہ احادیث مقدسہ سے بھی صاحب تعلیمات کی اس تاویل کی تائید ہو رہی ہے چنانچہ صحیح بخاری شریف میں یہ روایات ہیں (کتاب المزارعہ باب کراء الارض)۔

(۱) عن رافع بن خدیج ان النبی صلعم نھی عن کراء الارض۔

حضرت رافع بن خدیج سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کے لگان لینے سے منع فرمایا۔

(۲) عن جابر قال کانوا یزرعونھا بالثلث والربع والنصف فقال النبی صلعم من کانت لہ ارض فلیزرعھا او لیمنحھا

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم زمین کو تہائی چوتھائی اور نصف کی بٹائی پر دیا کرتے تھے۔ سو نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس کوئی زمین ہو وہ یا تو خود جوتے یا دوسرے کو دیدے۔

(۳) عن ابی ھریرہ قال النبی صلعم من کانت لہ

حضرت ابی ہریرہ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ

ارض فلیزرعها او یمنحها اخاه؛ جس کے پاس کوئی زمین ہو وہ خود اس کو جوتے یا اپنے بھائی کو دیدے۔

ان کے علاوہ حضرت رافع بن خدیج رضؓ سے ہی ایک اور روایت ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ ان کے چچا زمین کو پیداوار کی چوتھائی اور چند وسق کھجور اور جو کے عوض دیدیا کرتے تھے سو نبی اکرمؐ نے انہیں اس سے منع فرمایا اور فرمایا یا تو خود کاشت کے لیے دیدو یا روکے رکھو۔

اس کے ساتھ ہی حضرت ابن عمرؓ کا یہ واقعہ بھی بخاری میں درج ہے کہ وہ نبی اکرمؐ کے زمانہ سے لیکر حضرت معاویہ کے ابتدائی زمانہ تک زمین کو کرایہ پر دیا کرتے تھے۔ اس وقت انھیں رافع بن خدیج کی روایت کردہ حدیث پہنچی۔ انہوں نے رافع بن خدیجؓ سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ واقعی نبی اکرمؐ نے زمین کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے بعد اپنی زمین کرایہ پر دینی موقوف کردیں

ممکن ہے میں ان احادیث مقدسہ کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکا ہوں۔ اس لیے اس کے متعلق بھی وضاحت فرمادیجیے۔ لیکن اگر ان کا یہی مفہوم ہے جو بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ تو ان تصریحات کی روشنی میں صاحب تعلیمات عدم ملکیت اراضی کے نتیجہ پر پہنچ جائیں تو میرا خیال ہے کہ انہیں محض اشتراکیت کے خیال سے مرعوب تصور کر لینا درست نہوگا۔ اشتراکیت کے ثبوت میں تو وہ بخاری شریف کی اس حدیث کو اور بھی قوی دلیل سے پیش کرسکتے ہیں جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ:-

نحن لانورث ما ترکنا صدقۃ۔ ہم (انبیاء) سے وراثت نہیں ملتی ہے ہم جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں صدقہ ہے

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام حضرات انبیاء کرامؑ اس حد تک فطرۃ کمیونسٹ تھے۔

تقدیر | تقدیر کا مسئلہ جس طرح آپ نے بیان فرمایا ہے بعینہ اسی طرح صاحب تعلیمات نے بھی اس کو صفات الٰہی میں لکھا ہے ان کے بیان کے مطابق یہ ایمان مفصل کا جز ہے ایمان مجمل کا نہیں۔ اور آپ بھی ان کے ساتھ متفق ہیں لیکن یہاں مجھے ایک اور امر دریافت کرنا ہے۔ تقدیر کا مسئلہ جیسا کہ آپ نے فرمایا

فی الحقیقت بڑا اہتمام بالشان ہے، اور قرآن کریم نے اس پر بڑا زور دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ کو کونسی شکل میں مانا جائے کہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہو؟ تقدیر کے متعلق جو صورتیں ہمارے حضرات سلف نے اختیار کی ہیں، وہ تو ایک دوسرے سے ایسی متضاد ہیں کہ ایک کو ماننے کے لیے دوسرے سے قاطعیۃ انکار کرنا پڑتا ہے۔ جبر و قدر کے مسلک اس پر شاہد ہیں۔ اب عام طور پر جس قسم کا عقیدہ ہمارے "ایمان مجمل" کے اجزا میں داخل ہے (یعنی والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ) اس سے تو ظاہر ہے کہ یہ ایک جماعت کا عقیدہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو ایسا عقیدہ نہ رکھے بلکہ اس کے برعکس کسی دوسری جماعت کے عقیدہ کا ہم نوا ہو، اس کے ایمان کے متعلق کیا فیصلہ ہوگا؟

اتباع علماء و صلحاء اس مسئلے میں مجھے تھوڑی غلط فہمی معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے ساری بحث یہ سمجھ کر لکھی ہے کہ صاحب تعلیمات کے نزدیک علماء کا اتباع ناجائز ہے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں وہ ان کو واجب الاتباع قرار نہیں دیتے، اور وہ بھی اس وقت تک جب تک کہ قرآنی سند ان کے ساتھ نہ ہو یعنی کسی عالم یا امام کا قول ان کے نزدیک دینی حجت نہیں ہے تاوقتیکہ اس کی سند قرآن سے نہ دی جائے۔ بعینہٖ یہی مسلک مقلدین کا ہے، اور ان کے ائمہ کا خود دعویٰ ہے کہ جو بات ان کے پاس کتاب و سنت کے خلاف ہو اسے دیوار پر دے مارو۔

اتباع و اطاعت رسولؐ اس مسئلہ کے متعلق میں نے ایک مبسوط مضمون معارف میں اشاعت کے لیے بھیج رکھا ہے جس میں منکرین حدیث و اطاعت رسولؐ کے کم و بیش تمام اعتراضات کو سامنے رکھکر قرآن کی روشنی میں ان کا جواب دینے کی کوشش کی ہے مجھے خوشی ہوئی کہ اس باب میں آپکی تنقید کا یہ حصہ میرے شایع ہونے والے مضمون کا گویا توارد ہے میں نے ذرا پھیلا کر لکھا ہے۔ ناظرین ترجمان میں سے جنھیں اس باب میں دلچسپی ہو اسے ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ لیکن مجھے آپ کی "وما ینطق عن الھویٰ" کی تفسیر سے کچھ اختلاف ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ:۔

جس وقت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت پر سرفراز کیا اس وقت سے لے کر حیات جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسول خدا کی حیثیت رکھتا تھا"۔

پھر دوسری جگہ آپ نے فرمایا ہے :۔

"آنحضرت جس وقت جس حالت میں جو کچھ کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے"

اس سے مقصد واضح ہے کہ حضورؐ کا ہر قول و فعل منجانب اللہ ہوتا تھا، اور بہ حیثیت رسولؐ صادر فرمانے کی بنا پر امت مسلمہ کے لیئے واجب الاتباع۔

اس کے متعلق تفصیلاً تو میں نے اپنے مضمون مذکورہ صدر میں گزارش کیا ہے۔ اس لیے یہاں صرف دو ایک اشاروں پر اکتفا کروں گا پہلے تو قرآن کریم کو لیجیے۔ آپ کو متعدد امور ایسے ملیں گے جن میں حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تہدید و تادیب ہوئی ہے۔ مثلاً آپ نے ایک قسم کا شہد کھانے سے قسم کھالی۔ تو ارشاد ہوا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ۔ (تحریم)۔ اے نبی جس کو اللہ نے تمہارے لیے حلال کیا ہے اسے کیوں حرام کرتے ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر حضور کا شہد کو اپنے اوپر حرام کر لینا خدا کی جانب سے تھا تو خدا اس پر معترض کیوں ہوا۔

دوسری جگہ ہے :۔

عَفَا اللَّهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ (توبہ) خدا نے تم سے درگذر کیا، تم نے انہیں کیوں اجازت دیدی تھی

اب اگر حضورؐ کا اجازت دیدینا از روئے وحی تھا، اور یہ فعل خدا کے رسولؐ کی حیثیت سے تھا، تو اس پر وحی بھیجنے والے نے تہدید کس لیے فرمائی۔

اسی طرح عَبَسَ وَ تَوَلّٰی اَنْ جَاءَہُ الْاَعْمٰی۔ (عبس) میں اگر حضورؐ کا پیشانی مبارک پر بل دے آنا بہ حیثیت رسول تھا تو قرآن کریم میں اس پر تنبیہ کیوں آئی۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ حضورؐ کے یہ افعال و اقوال بہ حیثیت رسولؐ نہ تھے بلکہ ذاتی حیثیت سے تھے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ امور ضلالت و غوایت اور ہوائے نفس کے بنا پر تھے بلکہ یہ کہ امور دنیاوی میں بہ حیثیت بشر خاصہ بشریت حضور کے ساتھ تھا جس میں ایسے معمولی سہو کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اور اس سے حضور کے خلق عظیم۔ اور قرآن کے منجانب اللہ ہونے کے لیے دشمنان اسلام کے لیے زندہ شہادت ملتی ہے۔ اب اس کی شہادت خود احادیث سے بھی ملتی ہے شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک باب اس عنوان سے لکھا ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ جو کچھ آں حضرت سے مروی ہے اور کتب حدیث میں مدون ہے، اس کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ امور جو تبلیغ رسالت سے علاقہ رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ امور جن کو تبلیغ رسالت سے کوئی تعلق نہیں اسی کی نسبت حضور نے فرمایا ہے۔

اِنَّمَا اَنَا بشرا ذا امرتکم بشیءٍ من دینکم	میں ایک انسان ہوں جب تم سے کوئی مذہبی امر بیان کروں
فخذوا بہ واذا امرتکم بشیءٍ من رائی	تو اس کو اختیار کرو اور جو بات میں اپنی رائے سے کہوں
فانما انا بشر۔	تو میں ایک انسان ہوں۔

اسی بنا پر درخت خرما کے گابھا لگانے کے مشہور واقعہ کے بعد حضورؐ نے فرمایا تھا۔

انی ظننت ظنًّا ولا تواخذونی بالظن	میں نے صرف ایسا گمان کیا تھا تخمینی بات کا مجھ سے مواخذہ
ولکن اذا حدثتکم من اللہِ بشیءٍ فخذوا	نہ کرو لیکن میں خدا کی جانب سے کوئی بات بیان کروں تو
بہ فانی لم اکذب علی اللہِ۔	اس کو اختیار کرو اس لیے کہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا

چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں سے وہ امور ہیں جنھیں حضور عادۃً کیا کرتے تھے۔ یا اتفاقیہ بلا قصد یا بہ سبیل تذکرہ بیان فرمایا کرتے تھے۔ اور اس کے بعد وہ مواقع و امور کی مثالیں بھی بیان فرماتے ہیں

انہی میں وہ ان امور کو بھی لیتے ہیں جو حضور کے عہد میں ایک جزئی مصلحت رکھتے تھے لیکن وہ تمام امت کے لیے حتمی اور لازمی نہ تھے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ آپ دین کے متعلق فرماتے تھے وہی بہ حیثیت رسول ہوتا تھا، خواہ وہ وحی منزل ہو، یا اجتہاد رسول۔ اور وہی امت کے لیے واجب الاتباع۔ اور اس کے علاوہ جو باتیں بحیثیت بشر فرماتے ان میں یہ قید نہ تھی یہی وجہ ہے کہ بعض امور مشاورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہؓ نے رائے بھی پیش کی۔ اور وہ اختیار بھی کیگئی۔ یہی نہیں حضورؐ کی ایسی رائے کے خلاف عمل بھی تھا چنانچہ قرآن شاہد ہے کہ آپنے حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ اَمسك علیك زوجك لیکن انہوں نے حضرت زینبؓ کو طلاق دیدی۔ کیا آپ خیال کرسکتے ہیں کہ بحیثیت رسول آپکا فرمان ہوتا اور حضرت زیدؓ اس کی خلاف ورزی کرتے؟ کتب احادیث میں کئی ایسے واقعات مذکور ہیں جن میں حضورؐ نے کوئی ارشاد فرمایا اور صحابہ نے عرض کیا کہ یہ حکم بحیثیت رسول ارشاد فرمارہے ہیں۔ یا بطور اپنی رائے کے۔ چنانچہ جنگ بدر میں جب آپؐ ایک مقام پر کیمپ نصب فرمانا چاہتے تھے تو ایک صحابی نے یہی سوال کیا اور جب معلوم ہوا کہ حضور اپنی رائے سے ایسا فرمارہے ہیں تو انہوں نے بادب گذارش کیا کہ اگر حضورؐ ذرا اور آگے جاکر خیمہ زن ہوں تو زیادہ قرین مصلحت ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

ان تصریحات سے ثابت ہے کہ حضورؐ ہر آن اور ہر حال میں رسول نہیں ہوتے تھے اور آپ کا ہر قول اور ہر فعل بہ حیثیت رسول ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہاں جو مرد خدا محبوب کے رنگ میں ہی رنگا جانا چاہے اس کی بات بالکل جدا ہے لیکن اس شکل اور وجوب کی صورت میں بڑا فرق ہے۔

امارت و رسالت اگرچہ شاہ صاحبؒ نے حضورؐ کے فیصلے بھی اسی ذیل میں رکھے ہیں جو رسالت کی حیثیت لیے ہوئے نہ تھی۔ (غالباً ان کی مراد وقتی فیصلوں سے ہوگی)۔ اور صاحب تعلیمات نے بھی امارت کو جو رسالت سے الگ کیا ہے تو غالباً اسی بنا پر لیکن میں تو حضورؐ کے قضایا متعلقہ دین کو عین تبلیغ رسالت میں ہی سمجھتا ہوں۔ اور واجب الاتباع۔ البتہ ایک اور چیز ہے جو امارت و رسالت کی بحث میں میرے سامنے آگئی ہے۔ اور اگرچہ

صاحب تعلیمات نے اس پر بوضوح روشنی نہیں ڈالی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شاید منشا یہی ہے
جو میرے ذہن میں آیا ہے۔ جہاں تک نبی کریم کا تعلق ہے امور دین میں حضور کی اطاعت کیا بحیثیت رسول
اور کیا بحیثیت امیر قیامت تک کے لیے ہے۔ اس میں نہ اُس وقت کسی کو منازعت کا حق حاصل تھا۔
نہ آج ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ حضور کے بعد قرآن کریم نے جہاں خدا و رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم
دیا ہے۔ تو اسلامی نظام کے بقا کے لیے یہ تو ضروری ہے کہ کوئی ایسی (authority) ہو جو یہ بتا سکے
کہ خدا و رسول کا اس بارہ میں یہی فیصلہ ہے۔ یا وقتی امور میں ایسا ہی فیصلہ خود صادر کر سکے۔ ظاہر
ہے کہ اگر خلیفہ برحق ہو اور اس کے ساتھ اس کی مجلس شوریٰ (صحیح طریق پر منتخب شدہ) کام کر رہی ہو تو
یہی جماعت یعنی "خلیفہ ان کونسل" (Khalif in Council) ہی وہ آخری (
authority) ہو گی جو امت مسلمہ کے لئے "خدا و رسول" کو (Represent) کرے گی
یعنی اس مجلس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ اور کسی شخص کو اس کے خلاف منازعت کا حق نہ ہوگا۔
ورنہ اگر ہر شخص کو اختیار دیدیا جائے کہ وہ فردوہ إلى الله والى الرسول کا فریضہ خود ہی
سرانجام دے لے تو ظاہر ہے کہ نظام اسلام کسی طرح بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی مجلس Supreme
Council) ہو گی جس کے قضایا کی پھر کہیں اپیل نہ ہو گی۔ اور یہی جماعت فقہ مرتب
کرنے کا کام کرے گی۔ البتہ جب اس جماعت کا کوئی رکن کتاب وسنت کے خلاف فیصلے صادر کرے
تو جمہور کو یہ اختیار ہوگا کہ انہیں برطرف کر کے انکی جگہ دوسرا انتخاب عمل میں لے آئیں۔ کہ یہاں ایسے
اولی الامر سے منازعت کا حق حاصل ہو جائے گا۔ جماعت کو خدا و رسول کی اطاعت کی طرف نہیں لے
جاتا لیکن انفرادی طور پر کسی کو حق نہ ہوگا کہ ان کے فیصلوں سے اس بنا پر سرتابی شروع کر دے کہ وہ
اس کے اپنے خیال میں کتاب وسنت کے خلاف ہیں۔ یہی وہ (authority) ہو گی جو وقتی
امور میں بنا بر مصلحت کسی سابقہ وقتی فیصلے یا انتظام کے خلاف بھی فیصلہ کر سکے گی جیسا کہ کتب سیر و احادیث

سے ظاہر ہے۔ رسول اللہؐ نے نجران کے عیسائیوں اور خیبر کے یہود کو اپنی اپنی جگہ رہنے دیا لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں بنا بر مصلحت، وقت ان کو وہاں سے نکال دیا۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات خود خلیفہ وقت (مثلاً حضرت عمرؓ حضرت علیؓ) بھی عدالتوں میں بہ حیثیت مدعا علیہ پیش ہوا کرتے تھے جس سے ظاہر ہے کہ خلیفہ کے خلاف بھی ہر شخص کو مناز ست کا حق حاصل ہے، تو واضح رہے کہ یہ لوگ خلیفہ اور اس کی ذاتی حیثیت (Personal Capacity) میں فرق نہیں کرتے۔ عدالتوں میں عمر بن خطابؓ۔ اور علی بن ابی طالبؓ پیش ہوتے تھے۔ اور دعاوی ان کی ذات کے خلاف تھے نہ کہ "خلیفہ ان کونسل" کے خلاف۔ اور یہ اسلامی نظام حکومت کا طغرائے امتیاز ہے کہ اس نے قانون کو رائج کرنے والوں کو بھی قانون کی زد سے مستثنیٰ نہیں کیا۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ "خلیفہ ان کونسل" کی حیثیت بھی واضع قوانین کی نہیں ہوگی بلکہ جہانتک اصول قانون کا تعلق ہے وہ تو کتاب وسنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منضبط ہو چکے اب ان اصول کو نافذ کرنا۔ یا ان کی روشنی میں جزئی امور میں قواعد مرتب کرنا یہ اس مجلس کا فریضہ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ صاحب تعلیمات نے جہاں یہ لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں اطاعت خدا و رسول کا حکم آیا ہے اس سے مراد امارت ہی۔ ان کے پیش نظر یہی خاکہ ہے جو اوپر گذارش کیا گیا ہے اور اگر ایسا ہی ہے تو اس میں کسی اعتراض کی گنجایش نہیں کہ اس (authority) کی اطاعت عین اطاعت رسول ہے اور اس کی معصیت معصیت خدا و رسول جیسا کہ حضور نبی اکرمؐ نے خود ارشاد فرمایا کہ۔

من یطع الامیر فقد اطاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی جس شخص نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے اس کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

بحث طویل ہو گئی لیکن امید ہے کہ اس میں بہت سی کام کی باتیں نکل آئیں گی۔ اخیر میں اتنا گذارش کرنا ضروری ہے کہ چونکہ میں نے اس میں آپ کو مخاطب کیا ہے اس لیے وہی امور پیش کیے گئے ہیں جن میں مجھے آپ کے جواب کے بعد مزید اطمینان کی ضرورت نظر آئی رہے وہ امور جن سے اتفاق ہے، یا صاحب تعلیمات سے جن امور میں اختلاف ہے ان کو میرا تحصیل حاصل سمجھا گیا ہے اور یہ گذارشات بھی محض تطمین قلبی ہیں۔

الجواب

زمین کی شخصی ملکیت آپ تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا اسلم جیراجپوری نے جس آیت سے ملکیت زمین کا عدم جواز ثابت کرنا چاہا ہے وہ کوئی قانون بنانے والی آیت نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی آپ مجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تم ملکیت زمین کے جواز ہی میں کوئی آیت پیش کرو۔ قبل اس کے کہ میں آپکے اس مطالبہ کو پورا کروں میں قاعدہ کلیہ آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جب کسی رواج عام کے متعلق سکوت اختیار کیا جائے تو اس کو ہمیشہ رضا اور جواز ہی پر محمول کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر لوگوں نے زمین کو ایک گزرگاہ بنا رکھا ہو اور وہاں کوئی نوٹس اس فعل کی ممانعت کے لیے نہ لگایا گیا ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہاں راستہ چلنا جائز ہے۔ اس جواز کے لیے کسی اثباتی اجازت کا ہونا ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ وہاں ممانعت کا نہ ہونا خود ہی اجازت کا مفہوم پیدا کر رہا ہے۔ اسی طرح زمین کی ملکیت کا مسئلہ ہے۔ اسلام سے پہلے صدیوں سے دنیا میں یہ دستور جاری تھا۔ قرآن نے اس کی ممانعت نہ کی۔ کوئی صریح حکم اس کے موقوف کرنے کے لیے نہ دیا۔ کوئی دوسرا قانون اس کی جگہ لینے کے لیے نہ بنایا۔ اس کے معنی یہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پرانے دستور کو جائز رکھا، اور یہی معنی لیکر مسلمان ابتدائے اسلام سے ابتک زمین کو اسی طرح شخصی ملکیت بناتے رہے ہیں جس طرح اسلام سے قبل وہ شخصی ملکیت بنائی جاتی رہی تھی۔

قرآن کی تصریحات اس قاعدہ کے مطابق اگر قرآن میں زمینداری کی کوئی اثباتی اجازت نہ ہوتی تب بھی اس کا سکوت اجازت ہی کا ہم معنی ہوتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں قرآن بالکل ساکت نہیں ہے بلکہ متعدد مواقع پر اس نے زمینداری کے پرانے دستور کو تسلیم کیا ہے۔ زمین کی شخصی ملکیت دو ہی اغراض کے لیے ہوتی ہے۔ یا تو زراعت اور استثمار کے لیے، یا سکونت کے لیے۔ قرآن کریم ان دونوں اغراض کے لیے زمین

کی شخصی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے:۔

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (۶:۱۴۱)۔ — اس کے پھل میں سے کھاؤ جب کہ وہ پھل لائے اور اس کی فصل کٹنے کے دن اس کا (خدا کا) حق ادا کرو۔

یہاں خدا کا حق ادا کرنے سے مراد زکوٰۃ و صدقہ ہے ظاہر ہے کہ زمین کی پیداوار میں سے خدا کا حق خود خداوند تعالیٰ کو نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اس کے بندوں ہی کو دیا جا سکتا ہے۔ پھر اس کے بندوں میں سے بھی یہ حق اسی شخص کو دیا جائے گا۔ جو زمین نہیں رکھتا اور وہی شخص اس حق کو ادا کرے گا جو زمین رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پرانے نظام معاشی کو تسلیم کر لیا جس میں بعض لوگ زمین رکھتے تھے، اور بعض نہیں رکھتے تھے البتہ اس نظام میں اس نے اتنی اصلاح کر دی کہ زمین رکھنے والے لوگوں کی پیداوار میں زمین نہ رکھنے والوں کا حق قائم کر دیا۔ اسی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (۲:۲۶۷) — اے ایمان والو خرچ کرو اپنی پاک کمائیوں میں سے اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہیں

یہاں زمین کی پیداوار میں سے خرچ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ و خیرات ہے۔ اس حکم کی بجا آوری وہی شخص کرے گا جو پیداوار کا مالک ہوگا، اور انہی لوگوں پر یہ انفاق کیا جائے گا۔ جو صاحب مال و جائداد نہیں ہیں چنانچہ قرآن مجید میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ خیرات کے مستحق کون ہیں۔ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ (۲:۲۷۳) اور اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ الخ (۹:۶۰)

دوسری غرض کے متعلق سورہ نور میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا — اے مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل

غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى اَهْلِهَا نہ ہو جب تک مکان کے رہنے والوں سے پوچھ نہ لو اور (جب داخل ہو تو) ان کو سلام کرو..... اور اگر تم وہاں کسی کو نہ پاؤ

..... فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا

فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ (۲۴) تو ان میں نہ جاؤ تاوقتیکہ تم کو اجازت نہ دی جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سکونت کے لیے بھی زمین کو اپنی ملک میں رکھنا اللہ تعالیٰ نے جائز رکھا ہے اور مالک مکان کا یہ حق تسلیم فرمایا ہے کہ اس کے مکان میں کوئی شخص اس کی اجازت کے بغیر داخل نہ ہو۔

ممکن تھا کہ یہاں پھر اسی قسم کی نکتہ آفرینی نہ کی جاتی جیسی مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ میں کی گئی ہے۔ کہا جا سکتا تھا کہ ان تمام آیات میں صیغۂ جمع استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے مراد قوم کی اجتماعی ملکیت ہے نہ کہ فرداً فرداً ہر شخص کی ملکیت۔ مگر غنیمت ہے کہ مولانا اسلم جیراجپوری نے خود اس نکتہ آفرینی کا سد باب کر دیا ہے۔ وہ چوپایوں پر شخصی ملکیت تسلیم کرتے ہیں اور اس آیت سے دلیل لاتے ہیں کہ:-

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ (۳۶:۵)

اس آیت میں بھی صیغۂ جمع استعمال کیا گیا ہے، مگر مولانا نے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ تمام چوپائے تمام انسانوں کی مجموعی ملکیت ہیں۔ لہٰذا مذکورہ بالا آیات سے بھی یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن مجید زمین کے معاملہ میں اشتراکی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اشتراکیت اور اسلام میں اصولی فرق یہ ہے کہ اشتراکیت مالکین (Haves) اور غیر مالکین (Have nots) کی تقسیم کو بالکل مٹا دینا چاہتی ہے، مگر اسلام اس تقسیم کو باقی رکھ کر اس کی بے اعتدالیوں کا علاج زکوٰۃ و صدقہ سے کرتا ہے۔

تاویل احادیث | آپ نے جن احادیث کا حوالہ دیا ہے۔ ان میں زمین کی شخصی ملکیت کو ناجائز نہیں کہا گیا ہے۔ بلکہ "اپنے بھائی کو دیدینے یا روک رکھنے" کا ارشاد خود بتا رہا ہے کہ ملکیت تو جائز ہے البتہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ یہ تھا کہ مالک زمین اگر خود کاشت نہ کر سکے تو اپنے دوسرے بھائی کو کاشت کرنے کی اجازت دیدے۔ فقہاء کے ایک قلیل گروہ نے جن میں طاؤس اور ابن حزم ظاہری

شامل ہیں' ان احادیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ زمین کو کرایہ پر دینا مطلقاً ناجائز ہے لیکن جمہور فقہاء کی تحقیق یہ ہے کہ اس زمانے میں چونکہ مسلمانوں کی مالی حالت خراب تھی، اور بہت سے مہاجرین بے سرو سامانی کے عالم میں پڑے ہوئے تھے، اس لیے آن حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مالدار مسلمانوں کو مواسات اور رفق کی تعلیم دی، اور ان سے فرمایا کہ جن زمینوں کو تم خود کاشت نہ کر سکو ان میں اپنے دوسرے بھائیوں کو کاشت کرنے کی اجازت دے دو۔ لہٰذا ان احادیث میں جو نہی وارد ہوئی ہے وہ تحریم کے معنی میں نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول خود بخاری نے نقل کیا ہے۔

اِنَّ النبیّ صلے اللہ علیہ وسلم لم ینہ عنہ ولکن قال ان یّمنح احدکم اخاہ خیرٌ لہ من ان یاخذ شیئاً معلوماً۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا بلکہ آپ کا ارشاد یہ تھا کہ اگر تم میں کوئی شخص اپنے بھائی کو ویسے ہی زمین دیدے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اس سے کچھ کرایہ وصول کرے۔

ترمذی نے بھی ابن عباس کا یہ اثر نقل کیا ہے اور اس کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ ولکن اراد ان یرفق بعضھم ببعض (مگر حضور کی مراد یہ تھی کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی کریں)۔

حضرت ابن عمر کا جو واقعہ آپ نے نقل کیا ہے اس کا آخری حصہ چھوٹ گیا ہے۔ رافع بن خدیج نے جب ان کو نھی عن کراء الارض والی حدیث سنائی تو انہوں نے رافع سے کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو زمینیں کرایہ پر دی جاتی تھیں" (کنت اَعْلَمُ فی عھد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان الارض تکری) لیکن چونکہ حضرت ابن عمر کا تقویٰ بہت بڑھا ہوا تھا، اور وہ ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضور نے اس باب میں کوئی حکم دیا ہو اور وہ ان کے علم میں نہ ہو اس لیے انہوں نے محض احتیاطاً اپنی زمینیں کرایہ پر دینی بند کر دی تھیں۔

ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں زمیندار اپنی زمین کو کرایہ پر دیتے وقت

کسی خاص اور بہتر حصۂ زمین کی پیداوار کو اپنے لیے مخصوص کر لیتا تھا۔ اس طرح کا اشتراط چونکہ مجہول ہوتا تھا اور اس میں غرر پایا جاتا تھا اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع فرما دیا لیکن سونے چاندی کی مقررہ مقدار پر زمین کاشت پر دینا عہد رسالت میں جائز تھا۔ اس بحث کی تفصیلات فتح الباری جلد پنجم میں ص ۱۵ سے ۱۸ تک ملاحظہ فرمائیے۔

انبیاء کرام کی سنت | آخر میں جس حدیث سے آپ نے یہ شبہ نکالا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کمیونسٹ تھے اس پر اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کو کمیونزم سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔ انبیاء کرام کی ساری زندگی خدمت دین کے لیے وقف تھی۔ اس خدمت میں ان کا انہماک ان کو کسب معاش سے روکتا تھا۔ زیادہ تر ان کی بسر اوقات مومنین کے ہدایا پر ہوتی تھی یا ان فتوح پر جو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو عطا کرتا تھا۔ ایسے مال میں اپنی زندگی تک تصرف کرنا ان کے لیے جائز تھا لیکن اس کو ایسی ذاتی ملکیت بنا دینا کہ وہ ان کے بعد ان کی اولاد کو وراثت میں ملے ان کے نزدیک جائز نہ تھا، اور اپنی صداقت وللہیت کی بنا پر وہ اس کو مکروہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان قدسی نفس بزرگوں کا یہ دستور تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی پیروی کی، کہ جو کچھ وہ چھوڑ جائیں وہ قوم کے لیے صدقہ ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک بادشاہ اپنی زندگی تک ان اموال میں تصرف کر سکتا ہے جو اس کے قبضہ میں ہوں، لیکن اس کی وفات کے بعد اس مال میں قانون وراثت جاری نہ ہوگا۔ بلکہ وہ سب اموال اس کے جانشین کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔ اس کو کمیونزم کون کہہ سکتا ہے۔

مسئلہ تقدیر | عقیدۂ تقدیر کی لفظی صورت متعین کرنے میں اختلاف کی کافی گنجائش ہے لیکن اس کی معنوی صورت خود قرآن نے مقرر کر دی ہے، اور وہ بین الجبر والقدر ہے۔ کلیۃً جبر یا کلیۃً قدر کا جن لوگوں نے حکم لگایا ہے انہوں نے گویا بعض کتاب کو قبول کیا اور بعض کتاب کو اگر لفظاً نہیں تو معنیً رد کر دیا۔ عام طور پر اس عقیدہ کو جن الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ اپنی جگہ درست ہیں بلا شبہ بُری اور

بعلی تقدیر اللہ ہی کی طرف سے ہے لیکن اگر کوئی شخص ان الفاظ کا مفہوم بالکلیہ جبر کی طرف پھیر دے تو وہ مسلک صحیح سے ہٹ جائے گا۔ اسی طرح اگر اس عقیدے کے لیے کچھ دوسرے الفاظ استعمال کیے جائیں اور ان کا مفہوم بالکلیہ قدر کی طرف پھیر دیا جائے تو یہ بھی درست نہ ہوگا۔ صحت عقیدہ کا مدار در اصل الفاظ پر نہیں بلکہ معنی پر ہے آدمی یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرے کہ خداوند تعالیٰ قادر مطلق ہے، زمین و آسمان کی تمام چیزیں اس کے زیر حکم ہیں۔ کوئی شئے اس کے اذن کے بغیر نہ وجود میں آسکتی ہے، نہ حرکت کر سکتی ہے اور نہ فنا ہو سکتی ہے! انسان بھی تمام موجودات کی طرح اس کا محکوم ہے، اور اس کی توفیق کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ خداوند عالم نے انسان کو کچھ اختیار بھی دیا ہے جس کے غلط یا صحیح استعمال کی ذمہ داری یقیناً اس پر ہے، اور اس کا فرض ہے کہ اپنے اختیار تمیزی کو ٹھیک ٹھیک استعمال کر کے اپنی حد وسع تک کوشش کرے خواہ نتائج خاطر خواہ ہوں یا نہ ہوں، اس لیے کہ نتائج انسان کی سعی و عمل پر منحصر نہیں ہیں بلکہ مشیت آلہی کے تابع ہیں۔ یہ معنی جب ذہن میں راسخ ہو جائے تو انسان کو حق ہے کہ اس کو جس طرح چاہے ادا کرے۔ ممکن ہے کہ اس کو الفاظ کا کوئی ایسا جامہ نہ مل سکے جو پوری طرح اس معنی پر راست آجائے لیکن اگر اس کا عقیدہ صحیح اور کامل ہے تو الفاظ کے ناقص اور غیر جامع ہونے سے ایمان میں کوئی خرابی نہیں آتی۔

اب صرف اتباع و اطاعت رسولؐ کا مسئلہ قابل جواب رہ گیا ہے۔ چونکہ یہ تفصیلی بحث چاہتا ہے اور رسالہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ چوہدری صاحب کی بحث اور اس کا جواب ایک ساتھ درج کیا جاسکے اس لیے ہم نے ان کی بحث اسی اشاعت میں درج کر دی ہے اور اس کا جواب انشاء اللہ المستعان آئندہ اشاعت میں دیں گے۔

مطبوعات

وحی محمدی | تالیف علامہ سید رشید رضا ترجمہ عبدالرزاق ملیح آبادی ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت دو روپیہ کتاب خانہ دارالاشاعت ۱۱ بو بازار اسٹریٹ کلکتہ۔

علامۂ موصوف نے یہ کتاب اس نیت سے لکھی ہے کہ موجودہ تہذیب کی مالک قوموں اور ان کا اتباع کرنے والوں پر عقلی دلائل سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول خدا ہونا اور منزل من اللہ ہونا ثابت کریں، اور قرآن کے دینی، اجتماعی، سیاسی، مالی، جنگی اور امنی اصول و قواعد بیان کرکے یہ حقیقت ان کے ذہن نشین کر دیں کہ اسلام کے سوا کوئی مذہب یا کوئی نظام تمدن انسان کی دینی و دنیوی فلاح کا جامع اور ضامن نہیں ہے۔ فاضل مصنف اپنی روشن خیالی اور وسعت نظر کے لیے دنیا میں مشہور ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں اسلام کی ایک صحیح اور مکمل تصویر ایسے رنگ و روغن کے ساتھ پیش کی ہے جو نئے زمانے کے دماغوں کو اپیل کر سکتا ہے۔

تاریخ القرآن | تالیف مولانا مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی استاذ کلیہ جامعہ عثمانیہ ضخامت ۷۶ صفحات قیمت ۴ر مکتبۂ سیفیہ۔ مونگیر (بہار)۔

اس کتاب میں ان تمام شبہات کو جو قرآن مجید کی ترتیب و تدوین پر پیش کیے جاتے ہیں نقل کرکے ناقابل تردید دلائل سے رد کیا گیا ہے، اور قوی شہادتوں سے ثابت کر دیا گیا ہے کہ قرآن مجید جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، ویسا ہی ہم تک پہنچا ہے نہ اس کا ایک لفظ کم ہوا، نہ اس میں ایک لفظ کا اضافہ ہوا، اور نہ وہ ترتیب بدلی جو خود آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم فرمائی تھی۔

البینات | مرتبہ جناب محمد سلیم صاحب ضخامت ۳۲۹ صفحات قیمت دو روپیہ دفتر البینات۔ امراوتی (برار)

اس کتاب میں عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معیشت، معاشرت، سیاست وغیرہ مسائل کے متعلق

قرآن مجید کی آیات کو الگ الگ جمع کیا گیا ہے۔ ہر آیت کے مقابل اس کا صاف سلیس ترجمہ ہے، اور کہیں کہیں مختصراً آیات کی تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ ترتیب و تبویب عمدہ ہے، اور اس کے ذریعہ سے قرآن مجید کی تعلیمات کا ضروری علم بآسانی حاصل ہو سکتا ہے، کاغذ کتابت طباعت اور جلد بندی میں خوب اہتمام کیا گیا ہے۔ اگرچہ عام طور پر اس کا مطالعہ مفید ہوگا لیکن خصوصیت کے ساتھ ان لڑکوں اور لڑکیوں کو تو یہ کتاب ضرور پڑھانی چاہیے جو سرکاری مدرسوں میں پڑھتے ہیں، اور مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔

قرآن آموز تالیف مولوی نذیر بن ابی سلمیٰ ضخامت ۴۸ صفحات قیمت ۴ ر دفتر قرآن آموز۔ احاطہ شہزادہ محمد طاہر۔ لدھیانہ۔

مؤلف نے اس رسالہ سے ایک مفید سلسلہ کا آغاز کیا ہے جس کا مقصد بچوں میں اتنی استعداد پیدا کرنا ہے کہ وہ علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کیے بغیر قرآن مجید کو بقدر ضرورت سمجھ سکیں۔ اگر بچوں کو یہ رسالہ پڑھا دیا جائے تو وہ قرآن مجید کی زبان سے تھوڑے بہت روشناس ہو جائیں گے اور کسی حد تک سمجھ کر تلاوت کر سکیں گے۔

گلدستہ معانی از خان بہادر حاجی رحیم بخش صاحب ایم اے پنشنر ڈسٹرکٹ و سشن جج ضخامت ۴۶ صفحات۔ ملنے کا پتہ ۲ فرید کوٹ روڈ۔ لاہور۔

اس مختصر سے رسالہ میں مولف نے چند آیات کو لے کر ان کی لفظی و معنوی خوبیوں اور ان کے لاجواب طرز بیان پر بحث کی ہے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے اور اس کے حقائق و معارف پر غور کرنے کا ذوق پیدا ہو۔

الفرقان ماہوار رسالہ زیر ادارت مولوی محمد منظور صاحب نعمانی ضخامت ۷۰ صفحات قیمت سالانہ تین روپے دفتر الفرقان بریلی۔

ایک مذہبی و تبلیغی رسالہ ہے مذہبی رسائل پر عالمانہ رنگ میں بحث کی جاتی ہے اور عقاید و رسوم کی اصلاح کے اکثر مفید مضامین شائع ہوتے ہیں۔ مناظرانہ بحثوں کے لیے بھی ایک معتد بہ حصہ ہوتا ہے جن میں زیادہ تر مولوی احمد رضا خاں صاحب

اوران کے پیرووں، کے خلاف دیوبندی مسلک کی تائید کی جاتی ہے۔

قرآنک ورلڈ | سہ ماہی انگریزی رسالہ۔ زیر اہتمام مولوی ابو محمد مصلح صاحب ضخامت ۴۰ صفحات قیمت سالانہ للعہ

دفتر قرآنک ورلڈ۔ حیدر آباد۔

عرصہ ہوا کہ مولوی ابو محمد مصلح صاحب نے اس نام سے ایک نمونہ کا پرچہ شائع کیا تھا جس پر اسی زمانہ میں تبصرہ کردیا گیا تھا۔ اب ہمیں اس کا پہلا نمبر وصول ہوا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس کی باقاعدہ اشاعت شروع ہوگئی ہے رسالہ میں تمام تر مضامین قرآن مجید کے متعلق ہوتے ہیں لیکن کہیں کہیں خیالات کی بے اعتدالی بھی پائی جاتی ہے مثلاً نواب مرزا یار جنگ بہادر (سلطنت آصفیہ کے قاضی القضاۃ) نے اپنے مضمون "قرآن شریف کی تعلیمات کو کس طرح پھیلایا جائے" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قرآن مجید بغیر حفظ کرنا، انسانی قوت اور وقت کو ضائع کرنا ہے اور یہ کہ جو لوگ عربی نہیں جانتے ان کو نہ صرف قرآن اردو میں پڑھنا چاہیے بلکہ نماز بھی اردو ہی میں ادا کرنی چاہیے۔ یہ حد اعتدال سے صریح تجاوز ہے قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کے معانی کا ادراک کرنے کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں اس پر جتنا بھی زور دیا جائے، ہر ذی عقل اس سے اتفاق کرے گا لیکن فہم قرآن کی حمایت کے جوش میں اتنا بڑھ جانا کہ خود قرآن ہی کی تلاوت اور اس کے حفظ کو فضول اور تضیع اوقات قرار دے دیا جائے، اور نماز تک سے اس کو خارج کردینے کی تلقین کی جائے، کسی طرح جائز نہیں ہے۔ بادی النظر میں یہ بالکل ایک معقول بات معلوم ہوتی ہے کہ آدمی جس زبان کو جانتا اور سمجھتا نہ ہو اس کی کسی عبارت کو "طوطے" کی طرح رٹ لینا ایک لاحاصل فعل ہے لیکن اگر زیادہ غائر نظر سے دیکھا جائے تو اس خیال کی غلطی ظاہر ہوجائے گی قرآن مجید کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ قلب رسول پر صرف معانی کا القاء ہوا ہو اور ان معانی کو رسولؐ نے اپنی زبان میں ادا کردیا ہو بلکہ قرآن کے معانی اور الفاظ دونوں خدا کی طرف سے ہیں اور قرآن کا اطلاق صرف انہی الفاظ پر ہوتا ہے جو بذریعہ وحی آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئے ہیں۔ ان الفاظ کو چھوڑ کر محض ان کا مفہوم خواہ عربی میں بیان کیا جائے یا کسی اور زبان میں، اس کو "قرآن" نہیں کہا جاسکتا، نہ اس کی تلاوت "قرآن" کی تلاوت ہوسکتی ہے، نہ اس پر وہ

ثواب مترتب ہو سکتا ہے جو کلام الٰہی و آیات خداوندی کی تلاوت کے لیے مخصوص ہے اور نہ اس کو پڑھنے سے نماز ادا ہو سکتی ہے، کیونکہ نماز میں "قرآن" کا پڑھنا ضروری ہے، اور قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں ہے۔ علاوہ بریں یہ ایک حقیقت ہے کہ کلام الٰہی کے الفاظ میں اس قدر وسیع معانی پوشیدہ ہیں جن پر کوئی انسانی کلام حاوی نہیں ہو سکتا۔ انسان خواہ کتنے ہی علم و فضل اور بصیرت کے ساتھ اس کا ترجمہ کرے وہ ایسے الفاظ بہم پہونچا ہی نہیں سکتا جو الفاظ قرآنی کے تمام مفہومات کو ادا کرنے والے ہوں۔ اس لیے قرآن کا کوئی ترجمہ معنوی حیثیت سے بھی قرآن کا قائم مقام نہیں ہے۔ پھر صاحب مضمون کی نظر اس طرف بھی نہیں گئی کہ جس چیز کو وہ تصنیع وقت و تضییع قوت سمجھ رہے ہیں، اسی کی بدولت قرآن مجید ساڑھے تیرہ سو برس سے لفظ بلفظ محفوظ چلا آرہا ہے اگر ابتدا سے مسلمانوں کو قرآن کے بجائے اس کے تراجم کے ساتھ شغف رہتا تو آج عیسائیوں کی طرح مسلمانوں کے پاس بھی صرف ترجمے ہی ترجمے ہوتے جن کے اختلافات میں دین کی اصل ہی گم ہو کر رہ جاتی۔

مکتبۂ علمیہ

ایک مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم وفن کی اردو عربی فارسی اور انگریزی کتابیں مل سکتی ہیں۔ طلبہ کے لیے درسی کتابوں کا بھی انتظام کیا گیا ہے بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی حسب فرمایش کتابیں بھیجی جا سکتی ہیں۔

مکتبۂ علمیہ چار مینار حیدر آباد دکن

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن:۔ بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی اُن کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کیلیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹری نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز

اشاعت کیلیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شایع کرے۔

مینجر ترجمان القرآن خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

(طابع وناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی)

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن

آپ کا کتب خانہ

کون کون سی کتابوں سے خالی ہے

اس کا جواب ان الماریوں سے ملے گا جن میں آپ کی کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ نئی دنیا پرانے نظریوں کے متعلق کیا رائے رکھتی ہے اس کے مصنفین ہمارے سامنے کیا نئی باتیں پیش کر رہے ہیں۔ شاہ راہ ترقی پر کون کس سے آگے ہے اور پہلے کہاں تھا؟ ان تمام سوالات کے جواب آپ کو اپنے کتبخانہ سے ملنے چاہییں۔ مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آپ اپنے ذخیرہ پر پوری توجہ رکھیں۔ آج آپ اسی نظر سے اپنے کتبخانہ کو دیکھیے۔ جہاں عربی، فارسی اور خصوصاً اردو زبان کی تمام علمی ادبی تاریخی وفنی جدید و قدیم تصنیفات نہایت تلاش اور جستجو سے مہیا کی جاتی ہیں اور اکثر کمیاب قدیم تصانیف نہایت اہتمام سے خود طبع کرا کر پیش کی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں **درسی کتابیں** منظور شدہ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی از انفنٹ تا بی اے کلاس بزبان عربی، فارسی، اردو و انگریزی، مرہٹی، تلنگی، کنڑی وغیرہ نیز کنڈر گارٹن ماڈل کے سٹ و نقشہ جات دیواری رنگین ہر قسم کے چارٹس اسباق الاشیا وغیرہ مدارس کے اور دیگر دفاتر کے فارمس اور ڈرائینگ کا سامان بالکل

واجبی قیمتوں پر حاصل کیجیے

سید عبدالقادر تاجر کتب

مالک اعظم سٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر چار مینار حیدرآباد دکن